دلچسپ کہانیاں
ڈاکٹر رام آسرا راز

دِلچسپ کہانیاں

ڈاکٹر رام آسرا راز

ترقی اردو بیورو، نئی دہلی

DILCHASP KAHANIYAN
By : Dr. RAM ASRA RAZ

سنہ اشاعت : اکتوبر تا دسمبر 1983 شک 1905

پہلا ایڈیشن : 2000

قیمت : 8-50

سلسلۂ مطبوعات : ترقی اُردو بیورو 332

کتابت : بشیر احمد

اس کتاب کی طباعت کے لیے حکومتِ ہند نے رعایتی قیمت پر کاغذ فراہم کیا۔

ناشر : ڈائرکٹر ترقی اُردو بیورو، ویسٹ بلاک 8، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔ 110066

طابع : سُپر پرنٹرز، دہلی 51

پیش لفظ

کوئی بھی زبان یا معاشرہ اپنے ارتقاء کی کس منزل میں ہے، اس کا اندازہ اس کی کتابوں سے ہوتا ہے۔ کتابیں علم کا سرچشمہ ہیں، اور انسانی تہذیب کی ترقی کا کوئی تصور ان کے بغیر ممکن نہیں۔ کتابیں دراصل وہ صحیفے ہیں جن میں علوم کے مختلف شعبوں کے ارتقاء کی داستان رقم ہے اور آئندہ کے امکانات کی بشارت بھی ہے۔ ترقی پذیر معاشروں اور زبانوں میں کتابوں کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ کیونکہ سماجی ترقی کے عمل میں کتابیں نہایت موثر کردار ادا کرسکتی ہیں۔ اردو میں اس مقصد کے حصول کے لیے حکومتِ ہند کی جانب سے ترقی اردو بیورو کا قیام عمل میں آیا ہے ملک کے عالموں، ماہروں اور فن کاروں کا بھرپور تعاون حاصل ہے

ترقی اردو بیورو معاشرہ کی موجودہ ضرورتوں کے پیش نظر اب تک اردو کے کئی ادبی شاہکار، سائنسی علوم کی کتابیں، بچوں کی کتابیں، جغرافیہ، تاریخ، سماجیات، سیاسیات، تجارت، زراعت، لسانیات، قانون، طب اور علوم کے کئی دوسرے شعبوں سے متعلق کتابیں شائع کرچکا ہے اور یہ سلسلہ برابر جاری ہے۔ بیورو کے اشاعتی پروگرام کے تحت شائع ہونے والی کتابوں کی افادیت اور اہمیت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ مختصر عرصے میں بعض کتابوں کے دوسرے تیسرے ایڈیشن شائع کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی ہے۔ بیورو سے شائع ہونے والی کتابوں کی قیمت نسبتاً کم رکھی جاتی ہے تاکہ اردو والے ان سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا سکیں۔

زیرِ نظر کتاب بیورو کے اشاعتی پروگرام کے سلسلہ کی ایک اہم کڑی ہے۔ امید کہ اردو حلقوں میں اسے پسند کیا جائے گا۔

ڈاکٹر فہمیدہ بیگم
ڈائرکٹر ترقی اردو بیورو

فہرست

دیباچہ

ایک مشہور نعرہ "آج کے بچّے کل کے نیتا" کے مُطابق کسی بھی قوم کی ترقّی کا انحصار ایک بڑی حد تک اس کے بچّوں ہی پر ہے۔ موجودہ دَور میں وہی قوم ترقّی کر سکتی ہے جس کے بچّے اپنے ذہنوں کے دریچے زمانے کی تازہ ہوا کے لیے کُھلے رکھیں اور توہّمات و تعصّبات کے حصار میں بند نہ رہ کر باہمی محبّت، ہمدردی، رواداری اور انسان دوستی کے تقاضوں کو پورا کریں۔ بچّوں کی ذہنی نشو و نما مناسب تربیت، دِل میں شوق اور تجسّس پیدا کرنے کے لیے معلوماتی کتابوں اور دِلچسپ کہانیوں کی ضرورت ہے لیکن وہ لوگ جو اپنے بچّوں کے لیے مال و دولت جمع کرنے کے لیے ناحق پریشان رہتے ہیں، اس ضرورت کو پورا نہیں کر سکتے۔ مالی ورثے سے کہیں زیادہ بہتر ہے کہ وہ لوگ اُن کے لیے اپنی شائستہ عادات و اطوار کا سرمایہ چھوڑ جائیں۔ ان کی یہ نیکی اپنا اجر آپ ثابت ہوگی اور قِصّے کہانیوں کی شکل میں آئندہ نسلوں کے لیے بھی مشعل راہ بنے گی۔

کہانی سُننے سُنانے کی روایت انسانی تمدّن کے آغاز ہی سے ہر ملک اور ہر سماج میں پائی جاتی رہی ہے۔ ہندوستان میں بھی قدیم زمانے سے گوناں گوں کہانیوں کی روایت رہی ہے۔ ہماری کہانیوں کا سلسلہ ہمارے مختلف مذہبوں کی مُقدّس کتابوں، سنگیت، ناچ، ناٹک وغیرہ سے لے کر یہاں کی

سماجی زندگی کے عام واقعات کے ساتھ بھی جُڑا ہوا ہے۔ ان کا بیشتر حصّہ تو ہندوستانی زبانوں کے لوک ساہتیہ کی شکل میں محفوظ ہے لیکن ہمارے اس ادبی سرمائے کا کچھ حصّہ ایسا بھی ہے جو سینہ بہ سینہ ایک نسل سے دوسری نسل تک پہنچتا رہا ہے۔

بچپن ہی سے مجھے بھی ایسی کہانیاں سُننے سُنانے کا بے حد شوق رہا ہے۔ سینہ بہ سینہ منتقل ہونے والی کہانیوں کو ضبط تحریر میں لانے کی تمنّا تو پہلے بھی تھی لیکن اس کا موقع نہیں ملا تھا۔ اب جب ترقّی اُردو بیورو میں کام کرنے کا موقع ملا تو محسوس کیا کہ دوسری زبانوں کے ادب کے مُقابلے اُردو ادب میں بچّوں کے لیے اتنا اچھا لٹریچر دستیاب نہیں ہے۔ چنانچہ بچّوں کے لیے ایسی کہانیوں کو مرتب کرنے کی کوشش کی جن میں ہماری سماجی زندگی کی جھلک نمایاں ہو اور ان سے اخلاق کو بہتر بنانے میں بھی مدد ملے۔

اِن کہانیوں میں اگرچہ کسی قسم کی اخلاقی تعلیم کا برملا ذکر نہیں کیا گیا۔ پھر بھی کہانیاں پڑھنے کے بعد محسوس ہوگا کہ اس میں بیان کیے گئے واقعہ کی تہہ میں کوئی نہ کوئی ایسی بات مضمر ہے جو پڑھنے والے کے دِل پر چُپکے چُپکے کام کرتی ہے۔ میرے خیال میں بچّوں کی ذہنی اور اخلاقی نشوونما کے لیے ایسی ہی مِلی جُلی دلچسپ اور صحت مند کہانیوں کو آسان زبان میں پیش کرنے کی ضرورت ہے اور یہ کتاب اسی ضرورت کو پورا کرنے کی ایک کوشش ہے۔

ڈاکٹر رام آسرا راز

جائداد کی تقسیم

ایک چھوٹی سی بستی تھی۔ اس بستی میں کالو نامی ایک غریب آدمی اپنے دو چھوٹے چھوٹے بیٹوں کے ساتھ رہتا تھا۔ اس کے معمولی سے گھر میں کھجور کا ایک پیڑ تھا موٹی موٹی، میٹھی میٹھی کھجوریں لگا کرتی تھیں۔ اُس نے ایک گائے بھی پال رکھی تھی، جو ہری ہری گھاس کھا کر سفید سفید، میٹھا میٹھا دُودھ دیتی تھی۔ دونوں بچّے کھجوریں کھانے اور دُودھ پینے کے بڑے شوقین تھے۔

کالو کے بڑے بیٹے کا نام تھا مکندا اور چھوٹے کا نام بسنتا۔ مکندا جتنا چالاک اور لالچی تھا، بسنتا اُتنا ہی نیک دِل اور سیدھا سادہ لڑکا تھا کج خلق بچّے عموماً اپنوں کے لیے بھی پرائے ہوتے ہیں جب کہ خوش اخلاق بچّے غیروں کو بھی اپنا بنا لیتے ہیں۔ بسنتا اور مکندا ابھی چھوٹے ہی تھے کہ اُن کی ماں چل بسی۔ جب ذرا بڑے ہوئے تو باپ کا سایہ بھی سر سے اُٹھ گیا۔ باپ کے مرنے کے تھوڑے ہی عرصے بعد مکندا نے سوچا کہ ابھی تو بسنتا چھوٹا ہے۔ اسے اپنے نفع نقصان کی اتنی سمجھ نہیں ہو سکتی۔ بڑا ہونے پر اُسے کوئی بہکا دے گا اور جائداد کی تقسیم کے وقت یہ اپنا پورا پورا حصّہ مانگنے لگے گا۔ کیوں نہ ابھی سے باپ کی چھوڑی ہوئی جائداد اپنے قبضہ میں کرنے کی کوشش کی جائے۔ چنانچہ وہ اپنے اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کی تدبیریں سوچنے لگا۔

ایک بار رات کے وقت جب دونوں بھائی سونے کی تیاری کر رہے تھے تو مکندا نے بسنتا سے بڑے پیار سے کہا۔ "بسنت بھائی! زمانہ بڑا خطرناک ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ کوئی مکار ہمارے باپ کی جائداد پر قبضہ نہ کرلے۔ میرے خیال میں بہتر یہی ہوگا کہ ابھی سے ہم دونوں اِسے آدھا آدھا بانٹ لیں اور پھر اپنے اپنے حصّے کی حفاظت خود کیا کریں۔" یہ سُن کر بسنتا بڑا حیران ہوا۔ اُس نے کہا۔ "بھائی بانٹنے کے لیے ہمارے پاس رکھا ہی کیا ہے۔ ایک تو دو کمروں کا یہ مکان ہے، ایک گائے ہے، ایک کھجور کا پیڑ اور ایک کمبل ہے، وہ بھی پھٹا پُرانا اور بس۔ سوائے مکان کے باقی چیزوں کو ہم کیوں کر بانٹ سکتے ہیں۔"

مکندا ہنستے ہوئے بولا۔ "تم بھی عجیب لڑکے ہو۔ پتہ نہیں تمھیں عقل کب آئے گی۔ بانٹ کیسے نہیں سکتے۔ ہر چیز کو بانٹنے کا ایک طریقہ ہوتا ہے۔" یہ سُن کر بسنتا نے کہا پھر تم ہی بتاؤ کہ گائے کو ہم کیسے بانٹیں گے۔

مکندا دِل ہی دِل میں بڑا خوش ہوا کہ تیر خوب نشانے پر لگا ہے۔ پھر دِکھاوے کے لیے کچھ دیر سوچ کر بولا۔ "سُنو بھائی! مکان کے دو کمرے ہیں۔ ایک میں لے لُوں گا اور دوسرے میں تم رہو گے۔ اِسی طرح سمجھ لو کہ گائے کے بھی دو حصّے ہیں۔ اگلا حصّہ جو زیادہ قیمتی ہوتا ہے وہ تم لے لینا اور پچھلے حصّے کی دیکھ بھال میں کرتا رہوں گا۔ ایسے ہی کھجور کا پیڑ بھی بانٹ لیں گے۔ ذرا سوچنے کی بات ہے کہ کھجور کی اُونچی چوٹی پر تم نہیں چڑھ سکتے۔ تو کیا ہوا، وہ مجھے دے دینا لیکن اس کا تنا تمھاری ملکیت ہوگا۔ سیدھا سادہ بسنتا خوشی سے اُچھل پڑا، اور بولا۔ "واہ! بھائی ہو تو ایسا۔ کتنا فراخ دِل ہے میرا بھائی مکندا۔ میرا کتنا خیال رکھتا ہے۔ ایسی منصفانہ تقسیم تجویز کی ہے جس سے مجھے ذرا بھی تکلیف کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ اب رہا کمبل۔ تو اس کے تو شاید دو ٹکڑے کرنے ہی پڑیں گے۔ کیوں بھائی

مکندا؟"

مکندا نے سنجیدگی سے سوچتے ہوئے جواب دیا۔ "نہیں بسنتا ایسا نہیں ہوگا۔ نیک اولاد بزرگوں کی نشانی کی اس طرح دھجیاں نہیں اُڑایا کرتی۔ ترکیب ایسی بتاؤں گا کہ سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ کمبل کی تقسیم بھی ایسے ہی لاجواب طریقے سے ہوگی۔ سُنو! کمبل کو اس طرح سلامت رکھا جاسکتا ہے کہ سارا دِن گویا صُبح سے شام تک تو یہ کمبل تمہاری ملکیت میں رہے گا۔ کیوں! بن گئی نا بات۔"

بسنتا خوشی سے اُچھلتے ہوئے بولا۔ "یہ تو واقعی بڑی لاجواب تقسیم ہے۔ جو مجھے بالکل منظور ہے۔ اِدھر مکندا دِل ہی دِل میں خوش تھا کہ اس کی چالاکی کارگر ثابت ہوگئی ہے۔ اگلے ہی دِن بسنتا صبح سویرے کھُرپا لے کر نکل کھڑا ہوا — اور ہری ہری گھاس کاٹ کر ایک بڑا سا گٹھڑ باندھ لایا۔ گائے کو گھاس کھِلائی۔ پھر پانی پلایا۔ اس کے بعد تھوڑا سا تیل لے کر اس کے سینگوں پر مالش کی۔ جب وہ چمکنے لگے تو خوش ہوکر بولا۔ "دیکھو مکندا میری گائے کتنی خوبصورت لگتی ہے۔" پھر اس نے بالٹی اُٹھائی اور کھجور کے پیڑ کو پانی دینے لگا۔ غرض ان ہی کاموں میں وہ صُبح سے شام تک مصروف رہا۔ چالاک مکندا اُس کی تعریفوں کے پُل باندھ کر اُسے خوش کرتا رہا۔ کہ بسنتا میں تو سمجھتا تھا کہ تم نِکمّے لڑکے ہو۔ لیکن تم تو بڑے کام کے نِکلے۔ میرے بھائی۔ ایسے ہی اپنی چیزوں کا خیال رکھوگے تو لوگ بھی تمھیں بہت اچھّا سمجھیں گے۔

مکندا خود سارا دِن عیش کرتا اور گپ ہانکتا رہا لیکن شام ہوتے ہی بھگوان کا نام لے کر کھجور کی چوٹی پر چڑھ گیا اور بہت سی کھجوریں توڑ لایا۔ تھوڑی دیر بعد وہ بالٹی لے کر آیا اور گائے کی پیٹھ تھپ تھپا کر اُسے دوہنے بیٹھ گیا۔ دُودھ دُوہ کر وہ

اپنے کمرے میں لے گیا اور اکیلے ہی مزے لے لے کر کھجوریں کھاتا اور دُودھ پیتا رہا۔ بھوک تو بسنتا کو بھی خوب لگ رہی تھی۔ لیکن مانگنے پر بھی مکندا نے نہ تو اُسے دُودھ ہی دیا اور نہ ہی کھجوریں۔

دِن میں چونکہ اتنی سردی نہیں تھی۔ اِس لیے کسی نے بھی کمبل کی پرواہ نہ کی۔ جُوں جُوں سُورج ڈھلتا گیا، سردی محسوس ہونے لگی۔ بسنتا ابھی کمبل اوڑھ کر بیٹھا ہی تھا کہ مکندا نے کمبل کے لیے تقاضہ شروع کر دیا۔ "ارے بسنتا! دِن بھر یہ کمبل تمہاری ہی تو ملکیت تھا۔ شوق سے اوڑھے رہتے۔ دیکھتے نہیں ہو کر رات ہو رہی ہے۔ لاؤ اب یہ کمبل مجھے دے دو۔"

بسنتا نے سوچا، ہاں! بھائی ٹھیک ہی تو کہتا ہے۔ طے بھی تو یہی پایا تھا۔ چُپ چاپ کمبل مکندا کے حوالے کر دیا خود رات بھر سردی میں ٹھٹھرتا رہا اور مکندا ساری رات کمبل کی گرمی میں گہری نیند کے مزے لیتا رہا۔ اب تو مکندا کا یہی معمول بن گیا کہ دِن بھر وہ گپ ہانکتا رہتا اور صبح شام خوب پیٹ بھر کر کھجوریں کھاتا، دُودھ پیتا اور ٹھنڈی راتوں میں کمبل اوڑھ کر بڑے مزے سے سوتا۔ اِدھر بسنتا بے چارہ جب گائے اور کھجور کے پیڑ کی سیوا کرتے کرتے اور راتوں کو سردی سے ٹھٹھرتے ٹھٹھرتے تنگ آ گیا تو وہ بھی کسی اُستاد کی تلاش میں رہنے لگا جو اُسے اس مُصیبت سے چھٹکارا پانے کا گُر بتائے۔

کہتے ہیں، جو ڈھونڈتا ہے وہ پا لیتا ہے۔ آخر ایک دِن بسنتا کو بھی ایک اُستاد مل ہی گیا۔ وہ تھا چاچا سُندر۔ بسنتا نے چاچا سُندر کو مکندا کی مکّاری کا سارا قِصّہ سُنایا۔ سُندر نے بھی محسوس کیا کہ مکندا واقعی اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ زیادتی کر رہا ہے۔ بسنتا کی معصومیت اور سادگی پر اسے رحم آ گیا۔ اس نے کہا۔ "بسنتا! جانتے ہو میرا نام سُندر ہے۔ جیسا نام سُندر ہے ویسا ہی کام

بھی سُندر ہوتا ہے۔ ایسی سُندر ترکیب بتاؤں گا کہ تمہارے بگڑے کام بن جائیں گے اور مکندا زندگی بھر یاد رکھے گا۔ تم ذرا میرے پاس بیٹھو۔" بنتا جب اپنے چاچا سُندر کے اور قریب بیٹھ گیا تو بوڑھے چاچا نے اس کے کان میں وہ انمول منتر پھونک دیا جو آئندہ زندگی میں اس کے لیے مُشکل کُشا ثابت ہوا۔

دوسرے دِن اپنے معمول کے مُطابق مکندا جب گائے کا دُودھ دوہنے لگا تو عین اُسی وقت بنتا بھی تھوڑی سی گھاس اور ایک چھوٹی سی چھڑی لے کر وہاں پہنچ گیا اور چھڑی سے ہری ہری گھاس جھاڑ کر گائے کو کھلانے لگا۔ مکندا دِل ہی دل میں اس کی نادانی پر خوش ہو رہا تھا۔ لیکن بنتا تو موقع کی تلاش میں تھا۔ جب اس نے دیکھا مکندا کی بالٹی دُودھ سے بھرنے ہی والی ہے تو بنتا نے گائے پر سما کنی غُصّہ دِکھانا شروع کر دیا اور پھر زور زور سے دو ڈنڈے گائے کی تھوتھنی پر لگا دیے۔ گائے نے بِدک کر ایسی لات جمائی کہ مکندا قلابازیاں کھاتا ہوا دُور جا گرا۔ دُودھ کی بالٹی الگ لُڑھکتی پھر رہی تھی۔ گائے کے کھُونٹے کے پاس دُودھ ہی دُودھ بہہ رہا تھا۔ مکندا چوٹ کی تاب نہ لا کر زور زور سے چِلّانے لگا۔ "بنتا یہ کیا بدتمیزی ہے۔ میرا سارا دُودھ چوپٹ کر دیا۔ دیکھتے نہیں۔"

بنتا نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ "ہاں! ہاں بڑے آئے ہو تمیز والے۔ بکواس بند کرو۔ تمہارے حِصّے کی گائے کو تھوڑے ہی کچھ کہا ہے۔ کیا اب میرا اپنے حِصّے پر بھی کوئی حق نہیں۔ اپنے حِصّے کو مَیں جب چاہوں پُچکاروں اور جب چاہوں ماروں۔ تم کون ہوتے ہو میرے کام میں دخل دینے والے۔"

چالاک مکندا بھانپ گیا کہ اسے ضرور کوئی اُستاد مِل گیا ہے۔ گرمی سے کام نہ نکلتا دیکھ کر وہ فوراً نرم ہو گیا۔ پیار سے بولا۔ "بنتا بھائی! آج سے مَیں تمہیں آدھا دُودھ دے دیا کروں گا۔ تم پھر کبھی ایسی حرکت نہ کرنا۔" بنتا اپنے گُرمنتر

کی کامیابی پر خوش ہوتے ہوئے بولا ”آدھا دُودھ ہی نہیں دینا ہوگا بلکہ گائے کے لیے چارا مہیّا کرنے میں بھی ہاتھ بٹانا ہوگا۔ بولو منظور ہے تمہیں؟“

”ہاں بھائی! ہاں! تمہاری خوشی کے لیے مجھے سب کچھ منظور ہے۔ بس تم ناراض مت ہوا کرو۔“ مکندا نے کہا۔

دوسرے دِن کھجوریں توڑنے کے لیے مکندا جب پیڑ پر چڑھ گیا تو بسنتا بھی اپنی کُلھاڑی تیز کرنے لگا۔ اور تھوڑی ہی دیر میں کُلھاڑی کندھے پر رکھے وہیں پہنچ گیا اور لگا پیڑ کے تنے پر کُلھاڑی کے کرتب دِکھانے۔

مکندا نے پھر چلّانا شروع کیا۔ ”بسنتا یہ کیا کر رہے ہو۔ دیکھتے نہیں ہو۔ جس پیڑ کو تم کاٹ رہے ہو، اسی پر چڑھا مَیں کھجوریں توڑ رہا ہوں۔ اسے کاٹنا بند کرو۔ نہیں تو مَیں زمین پر آ گروں گا۔“

”خوب دیکھ رہا ہوں۔ لیکن تم کیوں گھبراتے ہو۔ ہر مُشکل اِنسان کی ہمّت کا امتحان لینے آتی ہے۔ بہادر بنو اور امتحان میں پورے اُترو۔ کھجوریں توڑنا جاری رکھو۔ تمہیں کون منع کرتا ہے۔ کچھ بھی کرو تم اپنے حِصّے کی کھجور پر۔ لیکن مجھے اپنے حِصّے کا تنا نہیں چاہیے اِسی لیے اسے کاٹ رہا ہوں۔“ بسنتا نے کُلھاڑی چلاتے ہوئے ذرا رعب سے جواب دیا۔

مکندا گڑگڑاتے ہوئے کہنے لگا۔

”بسنتا! مَیں تمہیں ہر روز آدھی کھجوریں دے دیا کروں گا۔ پیڑ کاٹنا بند کر دو۔“

”مکندا! مَیں جانتا ہوں تمہیں۔ اب شرافت دِکھانے کی کوشش نہ کرو۔ کھجوریں تو دو گے ہی، میرے ساتھ تمہیں پیڑ کو پانی بھی دینا ہوگا۔ اگر منظور ہو تو بولو ”ہاں“ ورنہ آج مَیں اِسے کاٹ کر ہی دم لوں گا۔“ بسنتا

نے ذرا تلخی سے کہا۔

مکندا کے پاس "ہاں" کہنے کے سوا چارہ ہی کیا تھا۔ بولا۔ "ہاں بھئی! ہاں، پیڑ کو پانی بھی دیا کروں گا۔"

بسنتا نے پیڑ کاٹنا بند کر دیا اور مکندا نیچے اُتر آیا۔ شام ہو رہی تھی۔ دونوں بھائی مل کر پیڑ کو پانی دینے لگے۔ بسنتا یکایک اندر گیا اور کمبل اُٹھا لایا اور اُسے پانی سے بھری بالٹی میں ڈال دیا۔ یہ دیکھ کر مکندا کو غصّہ تو بہت آیا لیکن دِل پر پتھر رکھ کر بولا۔

"ارے میرے بھائی بسنتا یہ تم نے کیا کر دیا۔ دیکھتے ہو رات ہو رہی ہے۔ پھر بھی تم نے کمبل کو بھگو دیا ہے۔ اب، کب یہ سُوکھے گا اور کب میں اِسے اوڑھ کر سو سکوں گا۔"

"بہت گندا ہو گیا تھا۔ سوچا آج اسے دھو لینا چاہیے۔ اس وقت تو یہ میری ہی ملکیت ہے نا۔ مَیں اِسے جس طرح چاہوں استعمال کروں۔ تم کیوں بگڑتے ہو۔ دِن ہونے کو ہے یا رات، یہ مَیں کچھ نہیں جانتا۔" بسنتا نے بڑی لاپرواہی سے جواب دیا۔

بُوڑھے چاچا سُندر کا گُر منتر سو فیصد کامیاب رہا۔ مکندا اپنے کیے پر بہت شرمندہ ہوا۔ اور بسنتا کے پاس آکر بولا۔

"میرے پیارے بھائی بسنتا! جائداد کی تقسیم میں مَیں نے واقعی تمہارے ساتھ بڑی زیادتی کی تھی۔ آج سے یہ جائداد پھر مشترکہ سمجھی جائے گی۔ گھر کا سارا کام ہم دونوں مل جُل کر کریں گے۔ ایک ساتھ بیٹھ کر کھجوریں کھائیں گے۔ برابر، برابر دُودھ پئیں گے اور رات کو ایک ساتھ کمبل اوڑھ کر سوئیں گے۔ اور آرام سے رہیں گے۔ یہ کہتے ہوئے وہ آگے بڑھا اور بڑے پیار سے بسنتا کو گلے سے

لگا لیا۔

بسنتا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”مکندا! تم مجھ سے بڑے ہو، نا۔“

”ہاں! اس میں کیا شک ہے۔“ مکندا نے جواب دیا۔

تو پھر یہ کبھی نہ بھولو کہ بڑے وہی ہوتے ہیں جو چھوٹوں کے لیے جیتے ہیں اور اپنے اُس فائدے کا خیال چھوڑ دیتے ہیں جو دوسروں کے لیے نقصان دہ ہو۔

قومی دولت

"آبِ زم زم والا آ گیا۔ کیا خوب رنگ لگا گیا۔ جو پیے میرا پانی، رہے گرمی نہ گرانی۔ پیو میرا ٹھنڈا پانی" یہ جانی پہچانی آواز اس ادھیڑ عمر غریب آدمی کی تھی۔ جو چمڑے کی بڑی سی مشک پیٹھ پر لادے شہر کی سڑکوں پر پانی بیچا کرتا تھا۔ وہ دِن بھر یُونہی چلاتا رہتا، تب کہیں جاکر چار پیسے کما پاتا تھا۔ اس کا اصل نام تو شاید ہی کسی کو معلوم ہو لیکن پیشے کی نسبت سے لوگ اسے مشکوب کہہ کر پکارتے تھے۔

ایک دن مشکوب صبح ہی سے اپنی مخصوص آوازیں لگا کر سڑکوں کے چکر کاٹتا رہا لیکن شام تک وہ اتنے پیسے بھی نہ کما پایا جس سے وہ پیٹ بھر کھانا کھا سکتا۔ مایوسی کے عالم میں کھڑا کچھ سوچ رہا تھا کہ اس کی نظر ایک اجنبی مسافر پر پڑی۔ مسافر کے گرد میں اَٹے کپڑوں سے لگتا تھا کہ وہ ایک لمبی مسافت طے کرکے آیا ہے اور خوب تھکا ہوا بھی ہے۔ مسافر نے مشکوب کی طرف دیکھا۔ مشکوب دِل ہی دِل میں خوش ہوا کہ چلو آخر کار ایک گاہک تو ہاتھ لگا۔ اُس نے پاس جاکر آواز لگائی "آبِ زم زم والا آ گیا۔ کیا خوب رنگ لگا گیا۔ جو پیے میرا پانی، رہے گرمی نہ گرانی۔ پیو میرا ٹھنڈا پانی۔ اپنی پیاس بجھاؤ اور تھکان کو دُور بھگاؤ۔"

مسافر نے کہا۔ "بھائی! مسافتیں طے کرتے کرتے میں تو خود ہی ایک سفر

بن گیا ہوں۔ اِس وقت بھی بہت دُور سے آ رہا ہوں۔ تھک کر چُور ہو گیا ہوں۔ پیاس بہت لگ رہی ہے۔ مگر کیا کروں، میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔

مشکوب کو اجنبی مُسافر پر رحم آ گیا۔ اس نے مُسافر کو نہ صرف پانی پلایا بلکہ ایک رات اپنے گھر ٹھہرنے کی اجازت بھی دی۔ مُسافر خوشی خوشی اس کے ساتھ چل دیا۔ گھر پہنچ کر مشکوب نے حسبِ توفیق اجنبی مُسافر کی خاطر تواضع کی اور رات کو آرام کرنے کے لیے ایک چارپائی اور بستر بھی دیا۔ مشکوب کے برتاؤ نے مُسافر کو بہت متاثر کیا۔

صبح ہوتے ہی مُسافر اُٹھ کھڑا ہوا اور مشکوب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے بولا "بھائی! آپ بڑے مہربان آدمی ہیں۔ آپ نے میرے ساتھ بڑی نیکی کی ہے۔ آپ کی مہمان نوازی کے لیے مَیں بہت شکر گزار ہوں۔ چاہتا ہوں کہ رُخصت ہونے سے پہلے آپ کو ایک مجرب دوا کی تیاری کا نُسخہ بتا دوں یہ دوا آپ جس مریض کو بھی دیں گے وہ بہت ہی جلد تندرست ہو جائے گا۔ اس کی بیماری خواہ کتنی ہی خطرناک کیوں نہ ہو" اس کے ساتھ ہی ایک کتاب مشکوب کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اِس کتاب میں اس مجرب دوا کی تیاری کا نسخہ اور طریقہ وغیرہ سب کچھ درج ہے۔ ہدایت پر پورا پورا عمل کیجیے اور یاد رکھیے کہ کسی بھی غریب آدمی سے دوا کی قیمت نہ لیجیے ورنہ دوا کا اثر جاتا رہے گا۔"

اس بڑی عنایت کے لیے مشکوب کا رواں رواں اجنبی مُسافر کا شکر گزار ہوتا جا رہا تھا۔ وہ مُسافر کا نام جاننا چاہتا تھا لیکن اس سے پیشتر کہ مشکوب کچھ کہہ پاتا، مُسافر چلتا بنا اور دیکھتے دیکھتے آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔

اُسی دِن سے مشکوب نے سڑکوں پر پانی بیچنا بند کر دیا۔ کتاب میں درج نُسخے پر عمل کر کے دوا تیار کی اور مریضوں کا علاج کرنا شروع کر دیا۔ شروع شروع میں تو

لوگوں کو یقین نہیں آتا تھا کہ مشکوب کی دوا میں اتنا فوری اثر ہوگا۔ لیکن جیسے جیسے مریضوں کو اس کی دوا سے شفا ملنے لگی، مریضوں کی تعداد بڑھتی گئی۔ اب تو اس کے شفا خانہ پر مریضوں کا ہجوم رہنے لگا۔ اور مسکین مشکوب کو لوگ حکیم مشکوب کے نام سے یاد کرنے لگے۔

اجنبی کی ہدایت کے مُطابق وہ غریبوں کو مُفت دوا دیتا تھا۔ البتّہ امیروں سے خوب پیسے لیتا تھا۔ لوگ مشکوب کی حِکمت کی تعریفیں کرتے نہیں تھکتے تھے۔ مشکوب روز بروز خوش حال ہوتا گیا۔ اُس نے اپنے لیے ایک اچھا سا گھر بنایا اور ایک خوب صورت عورت سے شادی کر کے بڑے آرام سے زندگی بسر کرنے لگا۔

جُوں جُوں مشکوب کی دولت بڑھتی گئی، لالچ اُسے بہکانے لگا اور وہ سوچنے لگا۔ بہت سے لوگوں سے دوا کے پیسے وہ آخر کیوں نہیں لیتا۔ یہ غریب لوگ اس کے کیا لگتے ہیں کہ وہ انھیں مُفت دوا دیتا رہے۔ ایک حکیم کو مریض کی غریبی اور امیری سے کیا مطلب۔ غریبوں کو مُفت دوا دے کر اُس نے سخت غلطی کی ہے۔ اگر وہ ایسی غلطی نہ کرتا تو آج شہر کا سب سے بڑا دولت مند شخص بن گیا ہوتا۔ خیر جو ہوا سو ہوا اب وہ کبھی ایسی غلطی نہیں کرے گا۔

اگلے دن ایک بے حد غریب آدمی اپنے بیمار بچّے کے لیے دوا لینے آیا۔ اس کے پھٹے پُرانے کپڑوں اور بدحالی کو دیکھتے ہوئے بھی حکیم مشکوب نے دوا دینے سے پہلے اس سے فیس طلب کی۔ اس غریب نے اپنی مجبوری صاف صاف ظاہر کر دی۔ لیکن حکیم نے اس کی لاچاری پر غور نہ کیا۔ غریب بے چارہ رونے لگا اور بولا۔ "حکیم صاحب یقین مانیے، میرے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں۔ خُدا کے لیے میرے بچّے کی جان بچا لیجیے۔ یہی میرا اِکلوتا بچّہ ہے۔ حکیم صاحب خُدا کے واسطے . . . . !"

حکیم مشکوب غُصّے میں لال پیلا ہو کر چلّایا۔ "نکل جاؤ یہاں سے۔ یہاں کوئی

خیرات بٹ رہی ہے۔ جو مُنہ اُٹھا کر خالی ہاتھ چلے آتے ہو۔ بھاگو یہاں سے ورنہ.....''

غریب بے چارہ تو مایوس لوٹ گیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی حکیم کی دواؤں کا اثر بھی فوراً زائل ہوگیا۔ دوا کو بے اثر پاکر وہ کتاب تلاش کرنے لگا۔ کتاب غائب ہوچکی تھی۔ اُدھر حافظہ بھی جواب دے چُکا تھا۔ لاکھ کوشش کرنے پر بھی وہ مجرب نسخہ اسے یاد نہ آیا۔ مریضوں کا ہجوم منتشر ہونے لگا۔ جلد ہی اس کی تمام جمع پُونجی ختم ہوگئی۔ رفتہ رفتہ مکان بھی نیلام ہوگیا اور پھر وہ غریبی کی اسی حالت پر پہنچ گیا جہاں سے اُس کے دن پھرے تھے۔

مرتا کیا نہ کرتا۔ پُرانی مشک کی مرمّت کروائی۔ اب پھر وہی مشک تھی اور وہی مشکوب۔ شہر کی وہی سڑکیں اور مشکوب کی وہی صدائیں "آب زم زم والا آگیا۔ کیا خوب رنگ لگا گیا۔ جو پیے میرا پانی، لے گرمی نہ گرانی۔ پیو میرا ٹھنڈا پانی"۔ دن بھر شہر کی سڑکوں پر چلتے چلتے وہ بہت دُبلا ہوگیا۔ پھٹے بانس کی طرح آواز بھی بے سُری ہوتی گئی۔ لیکن مشک پیٹھ پر لادے وہ بدستور سڑکوں پر گھومتا رہتا۔ ایک دن وہ حسب معمول گرد آلود سڑکوں پر چکّر لگا رہا تھا کہ دُور ہی سے اس نے ایک سانڈنی سوار مُسافر کو دیکھا۔ مشکوب اس کی طرف بڑھا تو مُسافر نے کہا۔ ''مشکوب بھائی! میں ایک بے یار و مددگار مُسافر ہوں۔ رہنے کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ اندھیرا چھانے کو ہے۔ ایک رات کے لیے اگر آپ مجھے اپنے گھر ٹھہرنے کی اجازت دیں تو مَیں آپ کا بہت شکر گزار ہوں گا۔ مشکوب اس دن کسی اجنبی کو اپنے گھر ٹھہرانے کے حق میں نہ تھا۔ مگر مہمان نوازی کے سماجی ضابطوں سے مُنہ موڑنا بھی بداخلاقی سمجھتا تھا۔ با دل ناخواستہ بولا۔ "ٹھیک ہے۔ چلیے! آج رات آپ میرے ہی گھر پر ٹھہریے۔"

گھر پہنچ کر مشکوب سے جیسا بھی بن پڑا! کھانے پینے کا بندوبست کیا۔ کھانے سے فارغ ہوئے تو مُسافر نے مشکوب کی مہمان نوازی کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔
"بھائی آپ بہت نیک آدمی ہیں۔ آپ کی مہمان نوازی انعام کی مُستحق ہے۔ مگر اس وقت دینے کے لیے میرے پاس کچھ نہیں۔ خیر جو کچھ بھی ہے وہ مَیں آپ کو ضرور دوں گا۔ مَیں ایک کیمیا گر ہوں۔ اور سونا بنانے کی ترکیب جانتا ہوں۔ یہ راز مَیں آپ کو بھی بتا دوں گا۔ مگر یاد رکھیے کہ سونا ایک قومی دولت ہے۔ قوم کے کروڑوں غریب مزدور جب مل کر کام کرتے ہیں تو دیش کی یہی مٹّی سونا اُگلنے لگتی ہے۔ اس لحاظ سے سونے کو پیدا کرنے والے دراصل غریب لوگ ہیں اس لیے تمہیں بھی اپنی ضرورتیں پوری کرنے کے بعد اپنی باقی دولت کو غریب عوام کی بھلائی کے کاموں میں لگانا ہوگا۔ اگر زیادہ سے زیادہ غریبوں کو زندگی کے لیے ضروری چیزیں آسانی سے ملنے لگیں گی تو دُنیا میں جلن، حسد، نفرت جیسے جذبات بھی پریم اور مُحبّت جیسی قوتوں میں بدل جائیں گے۔ اس طرح جب ہر گھر میں خوش حالی اور شانتی ہوگی تو ملک بھی دِن دونی رات چوگنی ترقّی کرے گا لیجیے! یہ کتاب "سونا بنانے کے راز" مَیں آپ کی نذر کرتا ہوں۔ اسے سنبھال کر رکھیے۔
یہ کہتے ہوئے مُسافر نے مشکوب کو وہ کتاب پیش کی۔
اسی رات مُسافر اور مشکوب نے مل کر کام کیا اور سونے کی بسکٹ نما۔ کچھ اینٹیں بھی تیار کیں۔ سونے کی اینٹیں دیکھ کر مشکوب حیرت سے بُت بنا کھڑا رہا۔ وہ مُسافر کو دروازے تک چھوڑنے بھی نہ جا سکا۔ اور مُسافر چلا گیا۔
مُسافر کے چلے جانے کے بعد بھی مشکوب کافی دیر تک سوچتا رہا کہ اگر لوگوں کو میرے سونے کا پتہ چل گیا تو وہ اسے چُرا لیں گے۔ اور پھر اگر مَیں یہ سونا غریبوں کو خیرات میں دیتا رہا تو خود دولت مند کیسے بنوں گا۔ لالچ نے ایک بار پھر اس

کی عقل پر پردہ ڈال دیا۔ اس نے فیصلہ کیا۔

"نہیں ایسا ہرگز نہیں کروں گا۔ مَیں خود امیر بنوں گا۔ لوگ میری عزت کریں گے اور مَیں ٹھاٹ سے رہوں گا۔ مَیں اپنا سونا بے کار نہیں لٹاؤں گا۔ کسی کو نہیں دوں گا۔"

مُسافر کے ساتھ مل کر بنائی ہوئی سونے کی اینٹوں سے مشکوب نے پھر ایک مکان خریدا۔ اچھے اچھے قالین بچھائے۔ قیمتی سامان سے گھر کو سجایا۔ اور عیش و عشرت سے زندگی بسر کرنے لگا۔ وہ مسافر کی اُس نصیحت کو بھول گیا کہ جس سونے نے اسے غریبوں سے بیگانہ بنا رکھا ہے، سونا پیدا کرنے کی اصل طاقت انھیں غریبوں کے ہاتھ ہیں اور اس قومی دولت میں اُن کا بھی کچھ حصّہ ہے۔

کچھ ہی عرصے بعد جب مشکوب کے پاس سے سونے کی تمام اینٹیں ختم ہوگئیں۔ تو اسے مُستقبل کی فکر ہوئی۔ اس نے فوراً مسافر کی دی ہوئی کیمیا گری کی کتاب کی طرف رجوع کرنا چاہا۔ لیکن یہ دیکھ کر اس کا سارا نشہ ہرن ہوگیا کہ وہ قیمتی کتاب تو پتّھر میں بدل چکی ہے۔ مستقبل میں روزی کے تمام دروازے بند ہوتے محسوس کرکے اس کی چیخ نکل گئی اور وہ بے ہوش ہوکر زمین پر گر پڑا۔

وقت گزرتا گیا اور کچھ ہی دِنوں بعد وہ پھر انھیں سڑکوں پر گھوم گھوم کر پانی بیچنے پر مجبور ہوگیا۔ ایک دِن جب وہ حسبِ معمول مشک اُٹھائے بڑی سڑک پر چکّر لگا رہا تھا، ایک گھوڑ سوار نے اس کے بالکل پاس آکر اپنا گھوڑا روکا اور کہنے لگا۔

"ارے مشکوب! مجھے پہچانتے نہیں۔ اس سے پہلے ہم دو بار مل چکے ہیں۔

پہلی بار مَیں نے تمہیں ایک لاجواب دوا کی تیاری کا نُسخہ بتایا تھا۔ مگر لالچ میں آ کر تم نے غریبوں کو بھی نہ بخشا اور ان ناداروں سے دوا کے مُنہ مانگے دام وصول کرنے پر تُل گئے۔ مَیں نے تمہارے ذہن سے نہ صرف وہ لاجواب نُسخہ بُھلا دیا بلکہ وہ لاجواب کتاب بھی چھین لی جس میں اس لاجواب دوا کی تیاری کی ترکیبیں لکھی تھیں۔ پھر مجھے خیال آیا کہ شاید تمہیں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہو۔ تو مَیں نے تمہیں سونا بنانے کے گُر بتائے۔ افسوس کہ تم نے پھر بھی میری بات پر عمل نہ کیا اور لالچ کا شکار ہو کر رہ گئے۔ مَیں نے اس ترکیب کی تیاری میں پورے 35 سال صرف کیے تھے۔ اور وہ سب غریب عوام کی بھلائی کے لیے کیا گیا تھا۔ مگر تم اِس قومی دولت کو بھی صرف اپنے ہی قبضے میں رکھنے پر اڑے رہے۔ اور غریبوں کا حق انھیں دینے میں کنجوسی کرتے رہے۔ یہی وجہ تھی کہ میری دی ہوئی قیمتی کتاب بھی پتھر بن گئی.....“

قطع کلام کرتے ہوئے مشکوب گڑگڑایا۔

”میرے مربّی! میرے محسن! مجھے معاف کر دیجیے۔ آئندہ کبھی ایسی غلطی نہیں کروں گا۔ لالچ اور خود غرضی نے مجھے اندھا کر دیا تھا۔ مجھے دیش کے غریبوں سے بیگانا بنا دیا تھا۔ اے عظیم انسان! مجھے معاف کر دیجیے میری کتابیں مجھے بخش دیجیے۔“

مُسافر نے کہا۔

”اب مجھے اچھی طرح پہچان لو۔ لوگ مجھے بو علی سینا کہتے ہیں۔ میری اپنی زندگی غریبوں اور محتاجوں کے لیے وقف ہے۔ مگر تمہاری سنگ دلی نے میری محنت پر پانی پھیر دیا اور دو قیمتی کتابوں کو پتھر بنا دیا۔ اب یہ پتھر پھر سے قیمتی کتابوں میں اس وقت تک نہیں بدل سکتے جب تک کہ تیرے جیسے

سنگ دِل لوگ اپنی زندگی غریبوں اور محتاجوں کی بھلائی کے لیے وقف نہ کر دیں۔ جو بھی شخص ایسا کرے گا۔ اسی کے دِل کی گرمی ان پتھروں کو پگھلا سکے گی اور صرف وہی درد مند دِل ان کتابوں میں بند حِکمت و دانش کو حاصل کر سکے گا۔ علم اور عقل سونے سے نہیں خریدے جا سکتے بلکہ سونا حاصل کرنے کے لیے علم اور عقل کے ساتھ ساتھ درد مند دِل بھی پیدا کرنا پڑتا ہے۔ ....." کہتے کہتے بو علی سینا کا سر ہلکی ہلکی جنبش میں آنے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ نظروں سے غائب ہو گئے۔

مقدّر کا سکندر

میاں بھوندو ماں باپ کے اِکلوتے بیٹے تھے۔ لاڈ پیار نے بچپن ہی سے ان کی عادتیں بگاڑ رکھی تھیں۔ بڑے ہو کر بھی کام سے کوسوں دُور بھاگتے تھے۔ بڑے بڑے باتیں بناتے رہتے تھے۔ بڑے ارمانوں کے ساتھ ماں باپ نے اُن کی شادی کی تھی۔ قسمت سے بیوی انھیں اچھی مل گئی تھی۔ دِن بھر محنت مزدوری کرنے کے بعد بے چاری گھر کا بھی سارا کام کرتی تھی۔ اور بھوندو میاں تھے کہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے۔ انھیں پانی تک بیوی خود پلاتی تھی۔ پھر بھی وہ بیوی پر خوب رعب جماتے اور کھانے پینے میں بہت ناک بھوں چڑھاتے۔

کچھ عرصے تک تو بیوی، شوہر کے اس رویّے کو خاموشی سے برداشت کرتی رہی۔ آخر کہاں تک صبر کرتی۔ بیوی نے انھیں سمجھانے کی کوشش کی کہ کچھ کام کرنا چاہیے۔

"کر مزدوری، کھا چُوری۔ کام سے ڈرے، بھُوکا مرے" کام کرنے ہی سے دُنیا کا کاروبار چلتا ہے۔ تم بھی کچھ کام کیا کرو۔ کروگے نہیں تو کھاؤ گے کہاں سے؟

بھوندو میاں ٹھہرے چکنے گھڑے۔ بیوی کی ان باتوں کا اثر وہ کب قبول کرنے والے تھے۔ وہ انھیں سمجھا بُجھا کر تنگ آ گئی۔ بے چاری کر بھی کیا سکتی تھی۔

"تنگ آمد بجنگ آمد"۔ گھر میں لڑائی جھگڑا رہنے لگا۔ ایک دن بیوی نے بھوندو میاں کی وہ گت بنائی کہ میاں نے ہتھیار ڈال دیے۔ بولے۔ "بیگم! آج تو بخش دو۔ کل سے ضرور کام پر جاؤں گا۔"

اگلے دن بھوندو میاں صبح سویرے ہی کام کی تلاش میں نکل پڑے۔ سارا دِن مارے مارے پھرتے رہے، مگر انھیں کہیں بھی کام نہ مل سکا۔ رات ہونے سے پہلے ہی اُن کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا۔ آگے کنُواں پیچھے کھائی۔ کام تھا کہ کوسوں دُور دِکھائی نہیں دیتا تھا۔ گھر میں بیوی بھُوکی شیرنی کی طرح ان کے پیچھے پڑی ہوئی تھی۔ اب وہ جائیں بھی تو کہاں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ آخر بھوندو میاں نے سوچا کہ اس بے حیائی کی زندگی سے تو موت اچھی ہے۔ یہی سوچ کر گھر جانے کی بجائے خودکشی کرنے کے ارادے سے وہ دریا کی طرف چل دیے۔

کرنی خُدا کی، اسی دِن تدبیر اور تقدیر میں باہم ٹھن گئی تھی۔ اور وہ دریا کے کنارے پر انسان کے رُوپ میں کھڑی جھگڑ رہی تھیں۔ دونوں ایک دوسری پر اپنی برتری کا سِکّہ جمانا چاہتی تھیں کہ اتنے میں بھوندو میاں آتے دِکھائی پڑے۔ دونوں نے فیصلہ کیا کہ کیوں نہ اسی شخص پر اپنے کرشموں کا تجربہ کیا جائے۔ چنانچہ بھوندو میاں جب اُن کے پاس سے گزرنے لگے تو تدبیر نے پُوچھا۔ "میاں! اِدھر کہاں جارہے ہو؟"

بھوندو میاں نے اپنی ساری سرگزشت کہہ سُنائی۔ ان کی رام کہانی سُننے کے بعد تدبیر نے کہا۔ "میاں اس طرح مایوس ہونے سے کام نہیں چلتا۔ حوصلہ رکھو تدبیر سے کام لو تو تمہیں جینے کا سلیقہ بھی آجائے گا۔ لو، مَیں تمہیں یہ موتی دیتی ہوں۔ اسے تم بادشاہ کے پاس لے جاؤ۔ وہ تمہیں اتنا زیادہ انعام دے گا کہ اس سے تم

کوئی بھی کام شروع کر سکو گے"۔

تدبیر کا دیا ہوا موتی لے کر وہ خوشی خوشی بادشاہ کے محل کی طرف چل دیا۔ وہاں پہنچ کر اُس نے موتی بادشاہ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ اس موتی کو دیکھ کر بادشاہ بہت خوش ہوا۔ اور انعام کے طور پر میاں بھوندو کو ایک بہت ہی قیمتی لعل دے کر رُخصت کیا۔ میاں بھوندو نے لعل کا نام تو سُنا تھا لیکن اسے دیکھنے کا زندگی میں یہ پہلا موقع تھا۔ لعل جیسی بیش قیمت چیز پا کر آج میاں بھوندو کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ مُستقبل میں اچھی زندگی گزارنے کے لیے دِل ہی دِل میں ہزاروں منصوبے بناتا چلا جا رہا تھا۔ کبھی وہ لعل کو چُھپاتا تھا، کبھی اُچھالتا تھا اور کبھی کبھی تو اسے چُوم بھی لیتا تھا۔

اب وہ جتنی جلدی ہو سکے گھر پہنچنے کے لیے بے تاب تھا۔ لیکن گھر جانے کے لیے اسے وہی دریا عبور کرنا تھا جس میں وہ خودکشی کرنے جا رہا تھا۔ کشتی میں بیٹھ کر جب وہ دریا پار کر رہا تھا تو لعل پانے کی خوشی اسے چین سے بیٹھنے نہیں دیتی تھی۔ بیٹھے بیٹھے اس نے لعل کو اُچھالنا شروع کر دیا۔ اچانک ایک مچھلی نے اُچھل کر وہ لعل چھین لیا۔ اور پانی میں غائب ہو گئی۔ میاں بھوندو کی ساری خوشی کافور ہو گئی اور وہ ہاتھ ملتے رہ گئے۔ بیش قیمت لعل کی بجائے اب اس کی آنکھوں کے سامنے پھر بیوی کا بپھرا ہوا چہرہ اور لال لال آنکھیں تھیں۔ اس کا دِل ایک بار پھر خوف سے دہل گیا۔ مگر اب اس کے پاس چونکہ ایک مقبول جواز تھا۔ اِس لیے اُس نے گھر جانے کا فیصلہ کر لیا۔

کافی رات گئے جب وہ گھر پہنچے تو بیوی اُن کا انتظار کر رہی تھی۔ بیوی کے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی میاں بھوندو نے لعل پانے اور کھونے کا پورا واقعہ کچھ بڑھا چڑھا کر کہہ سُنایا۔ میاں کی یہ داستان کافی موثر ثابت ہوئی۔ انھوں نے

پیٹ بھر کھانا بھی کھایا اور رات بھی بڑے سکون سے بسر کی۔ اگلے دن پھر وہ علی الصبح گھر سے چل دیے۔ سارا دن کام کی تلاش میں ٹھوکریں کھاتے پھرے لیکن کہیں کام نہ ملا۔ دن ڈھل رہا تھا۔ مایوس ہو کر انھوں نے پھر اسی دریا کا رُخ کیا۔ اور ٹھیک اسی جگہ پر ان کو پھر وہی دونوں صورتیں نظر آئیں۔

میاں بھوندو کو پریشان دیکھ کر تدبیر نے پھر اس کی پریشانی کا سبب پُوچھا۔ تو میاں بھوندو نے سارا ماجرا کہہ سُنایا۔ اب اس نے میاں بھوندو کی جان بچانے کی ایک اور تدبیر سوچی اور اسے ایک قیمتی انگوٹھی پیش کرتے ہوئے کہا کہ لو میاں اسی کو بیچ کر اپنا کام چلاؤ۔ انگوٹھی لے کر میاں بھوندو اب سیدھے گھر کی طرف چل پڑے۔ کچھ دیر تک تو اطمینان سے چلتے رہے۔ مگر تھوڑی دیر بعد انگوٹھی پانے کی خوشی میں ان کا دِل پھر مچلنے لگا۔ انھوں نے انگوٹھی جیب سے نکالی اور اُلٹ پلٹ کر دیکھنے لگے۔ پھر اسے ہوا میں اُچھال کر دل بہلانے لگے۔ سامنے درخت پر ایک چیل بیٹھی تھی۔ کہتے ہیں چیل کی نگاہ بہت تیز ہوتی ہے۔ دُور ہی سے اس سُنہری چیز پر اس کی نگاہ پڑ گئی۔ چیل میاں بھوندو پر جھپٹی اور انگوٹھی چھین کر ہوا ہو گئی۔ میاں کی ساری خوشی خاک میں مل گئی۔ اور وہ آنکھیں پھاڑ کر دیکھتے ہی رہ گئے۔ تھوڑی دیر بعد جب ہوش ٹھکانے آئے، تو دیکھا کہ چیل کے پنجوں نے بے چارے کے ہاتھ بھی لہولہان کر دیے ہیں۔ ڈرتے ڈرتے گھر پہنچے اور آج کی داستان بھی بیوی کو کہہ سُنائی۔ بیوی پہلے تو میاں کی ان باتوں پر یقین کرنے کو تیار نہ تھی مگر جب انھوں نے اپنے زخمی ہاتھ دِکھائے تو اُسے بھی یقین کرنا ہی پڑا۔

جُوں تُوں کر کے رات گزاری اور تیسرے دِن پھر میاں بھوندو صُبح سویرے ہی روزگار کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ اپنے معمول کے مُطابق دن بھر

سڑکیں ناپتے پھرتے رہے روزگار نہ مِلنا تھا نہ مِلا۔ ناچار دِل برداشتہ ہو کر ایک بار پھر اسی دریا کی طرف ڈوب مرنے کے اِرادے سے چل دیے۔ آج بھی تدبیر اور تقدیر اپنے اُسی ٹھکانے پر کھڑی اس کا انتظار کر رہی تھیں۔ تدبیر کے پُوچھنے پر میاں بھوندو نے پھر اپنی آپ بیتی تفصیل سے سُنائی تو اس بار تدبیر نے انھیں سونے کی کچھ اشرفیاں تھما دیں۔

اس بار میاں بھوندو نے طے کر لیا کہ چاہے کچھ بھی کیوں نہ ہو اب میں پہلے کی طرح کوئی حرکت نہیں کروں گا۔ اشرفیوں کو مضبوطی سے ہاتھ میں دبا کر وہ سیدھے گھر کی طرف چل دیے کچھ ہی دیر میں وہ صحیح سلامت گھر پہنچ گئے۔ گھر پہنچنے پر معلوم ہوا کہ بیوی تو کسی کام سے پڑوسن کے ہاں گئی ہوئی ہے۔ میاں تھوڑی دیر بھی انتظار نہ کر سکے۔ ایک کُھرپا اُٹھایا اور گڑھا کھودنے لگے۔ گڑھا بھی کوئی خاص گہرا نہ کھودا۔ لیکن اشرفیاں اس میں دبا کر بیوی کو خوش خبری سُنانے خود بھی پڑوسی کے گھر پہنچ گئے۔

میاں بھوندو جب گڑھا کھود کر اس میں اشرفیاں دبا رہے تھے تو پڑوس ہی کا ایک آدمی میاں کی اس حرکت کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ میاں کے مُنہ پھیرتے ہی اس نے گڑھے کو کھودا اور اشرفیاں نکال کر گڑھے کو پھر مِٹّی سے بھر دیا۔ اور خود اشرفیاں لے کر رفوچکّر ہو گیا۔

پڑوسی کے گھر پہنچ کر میاں نے اپنی بیگم کو خوش خبری سُنائی تو بیگم خوشی سے پھُولے نہ سمائی۔ میاں کو ساتھ لے کر فوراً گھر کی طرف بھاگی۔ گھر پہنچ کر میاں بیوی دونوں نے کھُرپا اُٹھایا اور گڑھا کھودنا شروع کر دیا۔ دیر تک دونوں مِل کر گڑھا کھودتے رہے لیکن کافی گہرا کھودنے پر بھی اشرفیوں کا نام و نشان تک نہ مِلا۔ مِلتا بھی کہاں سے۔ جب مقدّر ساتھ نہیں دیتا تو رکھا ہوا سونا بھی راکھ بن

جاتا ہے۔ لیکن بیوی اسے بھی بھوندو میاں کی چال سمجھ کر اس بیچارے پر برس پڑی۔ میاں نے بیوی کو یقین دلانے کی لاکھ کوشش کی لیکن بیگم تھی کہ انھیں مسلسل صلواتیں سناتی رہی۔ اور میاں بے چارے کو رات بھی بھوکے پیاسے ہی کاٹنی پڑی۔

اب تو میاں حد سے زیادہ تنگ آچکے تھے۔ اور اسے اپنی زندگی کا آخری دن سمجھ کر چوتھے دن بھی اپنے معمول کے مطابق جلدی ہی گھر سے روانہ ہو گئے۔ اور پہلے کی طرح دن بھر مارے مارے پھرنے کے بعد سچ مچ اپنی زندگی کو ختم کر دینے کے لیے آخری بار دریا کی طرف چل دیے۔ اس بار میاں بھوندو کی طرح ہی تدبیر نے بھی اپنی ہار مان لی تھی اور میاں بھوندو کی مدد کرنے سے انکار کر دیا۔

تدبیر کے ہار مان لینے پر محترمہ تقدیر فاتحانہ شان سے آگے بڑھ کر بولیں ۔

"تدبیر جن کو نامراد رکھتی ہے، ان کی مرادیں تقدیر پورا کرتی ہے۔ اب ذرا میرا بھی معمولی سا کرشمہ دیکھیے۔ میں اسی شخص کو مقدر کا سکندر بنا کر دکھاتی ہوں۔ اپنی طرف سے میں اسے کوئی خزانہ عطا نہیں کروں گی پھر بھی دیکھنا کہ دولت کی روٹھی ہوئی رانی کس طرح خود بخود اس کی طرف کھینچتی چلی آتی ہے۔" یہ کہتے ہوئے تقدیر نے میاں بھوندو کو صرف ایک اشرفی دے کر کہا۔

"لو، میاں اسی سے اپنا گزارہ کرو۔ اگر خدا نے چاہا تو اسی میں اتنی برکت ہوگی کہ زندگی آرام سے گزرے گی۔"

آج میاں بھوندو نے اس ایک اشرفی کو غنیمت سمجھتے ہوئے سیدھے گھر کی طرف جانے کی بجائے بازار کی راہ لی۔ بازار سے انھوں نے کچھ آٹا، نمک، مرچ، ہلدی وغیرہ کے علاوہ پکانے کے لیے ایک اچھی سی موٹی تازی مچھلی بھی خریدلی اور گھر کا راستہ لیا۔ بیگم نے جب میاں کو اتنی ساری چیزیں لے کر آتے دیکھا تو بہت

خوشی ہوئی۔

آٹے، نمک، ہلدی وغیرہ کو سلیقہ سے الگ الگ ڈبوں میں ڈال کر بیگم نے مچھلی کو صاف کرنا شروع کیا۔ میاں بھوندو کلہاڑی اُٹھا کر لکڑیاں کاٹنے چلے گئے۔ جس درخت سے وہ لکڑیاں کاٹنا چاہتے تھے اسی پر میاں کو ایک گھونسلہ دکھائی پڑا۔ گھونسلے میں کلبلاتے بچّوں کو بچانے کے خیال سے میاں نے سوچا کہ پہلے گھونسلہ اُتار لیا جائے تو مناسب ہے۔ میاں جب گھونسلہ اُتار کر نیچے لائے تو کیا دیکھتے ہیں کہ سونے کی وہی انگوٹھی جو اُن کے ہاتھ سے چیل جھپٹ کر لے گئی تھی، اس گھونسلے میں رکھی ہے۔ انگوٹھی اُٹھا کر اپنے قبضے میں کرتے ہوئے وہ خوشی سے پاگل ہو اُٹھا اور زور زور سے چلّانے لگا "پکڑا گیا۔ آج چور پکڑا گیا"۔

اتفاق سے عین اسی وقت وہاں سے وہ شخص بھی گزر رہا تھا۔ جس نے گڑھا کھود کر میاں کی اشرفیاں چوری کی تھیں۔ جب اس نے میاں کو اس طرح "چور پکڑا گیا" کا شور مچاتے سُنا تو وہ گھبرا گیا۔ سمجھا کہ میاں نے مجھے پہچان کر شور مچایا ہے۔ چور کی ڈاڑھی میں تنکا کے مصداق وہ میاں بھوندو کے روبرو گڑگڑانے لگا۔ "میاں جی! میں آپ کی اشرفیاں واپس کر دوں گا۔ اس طرح شور مچا کر مجھے ذلیل نہ کرو۔ خدا کے لیے مجھے معاف کر دو۔ مجھ سے غلطی ہوئی۔ میں آپ کی اشرفیاں ابھی واپس کرتا ہوں"۔

یہ سُن کر میاں بھوندو جو اب واقعی مقدّر کا سکندر تھا شیر کی طرح گرجا، "میری اشرفیاں فوراً واپس کرو۔ ورنہ ابھی پولیس کے حوالے کرتا ہوں"۔ چور بے چارہ بھاگ کر گیا اور گھر سے لا کر اشرفیاں بھوندو میاں کو دے گیا۔

گھر پہنچ کر میاں بھوندو نے انگوٹھی اور اشرفیاں ملنے کی خوش خبری بیگم کو سُنائی تو وہ خوشی سے ناچنے لگی۔ بیگم مچھلی کو صاف کر چکی تھی۔ میاں بیوی دونوں نے مل کر

مچھلی کو کاٹنا شروع کیا۔ جب اس کا پیٹ چاک کیا گیا تو یہ دیکھ کر میاں بیوی دونوں ہی خوشی سے پاگل ہو اُٹھے کہ ان کا کھویا ہوا قیمتی لعل بھی اس مچھلی کے پیٹ میں موجود تھا۔ اب تو مچھلی پکانے کی بھی کوئی جلدی نہ تھی۔ بیگم نے آنکھیں نچاتے ہوئے کہا۔ "میاں! مجھے تو یقین ہی نہیں آتا تھا لیکن . . . . خیر اب انھیں کہیں ٹھکانے لگانے کی تدبیر سوچو۔"

میاں بھوندو نے خوشی سے اُچھلتے ہوئے کہا۔ "کیوں نہیں، تدبیر سوچے بغیر کام کیسے چلے گا۔ تدبیر ہی تو تقدیر کو جگاتی، اور آدمی کو مُقدّر کا سکندر بناتی ہے۔"

شاہی انعام

بہت پُرانی بات ہے کہ کسی ملک کی راجدھانی میں ایک میراثی رہتا تھا۔ شہر کی ایک غریب بستی میں اس کی ایک چھوٹی سی جھونپڑی تھی۔ جس میں وہ اکیلا ہی رہتا تھا۔ سوائے خدا کے دُنیا میں اس کا کوئی نہیں تھا۔ وہ سیدھی سادی ایماندارانہ زندگی گزارتا تھا۔ حاضر جوابی اس کی خاصیت اور گانا بجانا اس کا پیشہ تھا۔ چنانچہ گا بجا کر ہی اپنا پیٹ پالتا تھا۔ گانے بجانے سے چار پیسے مل جاتے تو کھا لیتا ورنہ بھوکا ہی سو رہتا۔

ایک بار وہ دن بھر شہر کی گلیوں میں گاتا بجاتا رہا۔ لیکن کسی نے ایک پیسہ نہ دیا۔ رات کو وہ اپنی جھونپڑی میں آیا اور بھُوکا ہی سو رہا۔ دوسرے دن پھر صبح سویرے گانے بجانے کے لیے نکل پڑا۔ اس دن بھی وہ بے چارہ خالی ہاتھ لوٹا۔ نہ کسی نے ایک پیسہ دیا اور نہ روٹی۔ رات کو جب وہ اپنی جھونپڑی میں آیا تو پیٹ میں چوہے کُود رہے تھے۔ غریب آدمی کے گھر کا چراغ تو ویسے بھی شام ہی سے بُجھا سا رہتا ہے۔ اس دن وہ اور بھی جلدی سو گیا۔ مارے بھُوک کے اُسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ گانا بجانا ہی تو اس کا پیشہ ہے۔ اور اس میں وہ اپنی طرف سے کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھتا۔ پھر نہ جانے کیوں لوگ اس کے گانے میں دِلچسپی نہیں رکھتے۔ اگر لوگوں کی دِلچسپی کا یہی حال رہا تو

ایک دِن اسے بھوکوں مرنا پڑے گا۔

آخر اسے ایک ترکیب سُوجھی۔ اُس نے سوچا کہ ہمارے مُلک کا بادشاہ بہت رحم دِل اور سخی ہے۔ کیوں نہ کل اسی کے دربار میں جاکر قسمت آزمائی کی جائے۔ ہو سکتا ہے کہ بادشاہ یا اس کے کسی درباری کو اس کا گانا پسند آجائے اور کھانے پینے کو کچھ مِل جائے۔ یہی سوچتے سوچتے اس نے رات گزار دی۔

اگلے دن صبح سویرے ہی اس نے اپنا ڈھول اُٹھایا اور بادشاہ کے دربار کی طرف چل دیا۔ پیدل چلتے چلتے دوپہر ہوگئی تھی۔ بادشاہ دربار برخاست کرنے ہی والا تھا کہ اتنے میں وہ بھی پہنچ گیا۔ اس نے دربان سے درخواست کی کہ اندر بادشاہ کو اطلاع کر دے کہ ایک میراثی اپنا گانا سُنانے کے لیے حاضر ہوا ہے۔ دربان نے خبر پہنچائی۔ اس وقت بادشاہ کی مزاجی کیفیت اچھی تھی اس نے میراثی کو گانے کی اجازت دے دی۔ دربان نے جب آکر بتایا، تو میراثی نے وہیں دروازے پر کھڑے اپنا گانا بجانا شروع کر دیا۔ بادشاہ کو اس کا گانا اتنا اچھا لگا کہ وہ کافی دیر تک اس کا گانا سُنتا رہا۔

گانا سُنتے سُنتے اچانک اسے یاد آیا کہ میراثی لوگ تو بڑے مسخرے اور حاضر جواب ہوتے ہیں۔ کیوں نہ آج اس کی حاضر جوابی کو بھی آزمایا جائے۔ بادشاہ نے اسے اندر بُلا لیا اور اس کے گانے کی تعریف کرتے ہوئے بولا۔ "ارے میراثی! تم تو چُھپے رُستم نِکلے۔ اتنا اچھا گانا بجانا جانتے تھے، تو کبھی پہلے کیوں نہیں آئے۔ تمہارا فن تو واقعی انعام کا مستحق ہے۔" اور ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بادشاہ نے پُوچھا۔ "میر بھائی! میرے چہرے پر تو اتنے گھنے بال ہیں لیکن میری ان ہتھیلیوں پر بال کیوں نہیں ہیں؟"

میراثی تو بادشاہ کی زبان سے انعام کا لفظ سُن کر ہی خوش ہوگیا تھا۔ چہک کر

کہنے لگا۔ ”حضور! آپ بہت سخی ہیں نا، ہر وقت سخاوت کرتے رہتے ہیں اور لوگوں کو اتنا دیتے رہتے ہیں کہ دیتے دیتے آپ کی ہتھیلیوں کے بال غائب ہو گئے ہیں۔“

بادشاہ یہ جواب سُن کر خوش ہو گیا۔ اور پُوچھنے لگا۔ ”ہاں، میر بھائی! میری ہتھیلیوں کے بال تو خیرات دیتے دیتے گھس گئے ہیں، تمہاری ہتھیلیوں پر بال کیوں نہیں ہیں؟“

”حضور! اصل میں انعام پانے کا موقع تو آج ملا ہے۔ لیکن اس سے پہلے خواب ہی میں ہر روز آپ سے کچھ نہ کچھ لیتا رہا ہوں۔ یہاں تک کہ لیتے لیتے میری ہتھیلیوں کے بال بھی گھس گئے۔ میراثی نے جواب دیا۔

بادشاہ اور بھی زیادہ خوش ہو گیا۔ اور دربار کے حاضرین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھنے لگا۔ ”میر بھائی! اگر یہ بات ہے تو ان سب کی ہتھیلیوں پر بال کیوں نہیں ہیں؟“

میراثی نے فوراً جواب دیا۔ ”حضور! جب بھی آپ کسی کو کچھ دیتے ہیں تو یہ سب لوگ حسرت اور ارمان سے اپنی ہتھیلیاں مَلتے رہتے ہیں۔ اسی لیے اِن کی ہتھیلیوں کے بال بھی گھس گئے ہیں۔“

میراثی کی حاضر جوابی سے بادشاہ بہت خوش ہوا۔ اس نے میراثی سے کہا۔ ”میر بھائی! تمہارے گانے بجانے اور حاضر جوابی نے ہمارا دل خوش کر دیا ہے۔ اسی خوشی میں ہم تمہیں ایک ہاتھی انعام دیتے ہیں۔

کچھ ہی دیر میں ایک اچھا خاصا پہاڑ سا ہاتھی میراثی کے سامنے کھڑا تھا۔ لیکن اُسے اس شاہی انعام کی کوئی خوشی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس خوشی سے کیا فائدہ جو غم کا کانٹا بن کر چُبھتی رہے۔ وہ کبھی ہاتھی کو دیکھتا تھا، کبھی شاہی محل کو اور کبھی اپنے آپ کو۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا بھُوکا پیاسا

بادشاہ کے پاس آیا تو اس لیے تھا کہ کھانے پینے کو کچھ مل جائے گا۔ لیکن بادشاہ بھی اس کے دِل کا درد نہ جان سکا۔ انعام بھی دیا تو کیا ــــ ہاتھی ــــ جو نہ اس کے پیٹ کی بھوک مِٹا سکتا ہے اور نہ اوڑھنے بچھونے کا کام دے سکتا ہے۔ میراثی کا جی تو چاہتا تھا کہ وہ ہاتھی بادشاہ کو واپس کر دے اور اپنے یہاں آنے کا مقصد صاف صاف لفظوں میں اسے بتا دے۔ مگر ڈرتا تھا کہ کہیں اس کی یہ حرکت بادشاہ کو ناگوار نہ گزرے۔

ناچار وہ اس شاہی انعام کو لے کر گھر لوٹ آیا۔ اور آکر سوچنے لگا کہ بادشاہ نے میرے ساتھ کتنا بڑا مذاق کیا ہے۔ کہاں اتنا بڑا ہاتھی اور کہاں یہ چھوٹی سی جھونپڑی۔ اب میں اسے باندھوں بھی تو کہاں باندھوں۔ پھر مجھے اپنے کھانے کے لیے تو دو وقت روٹی نہیں ملتی۔ اب اسے کھلانے کے لیے کہاں سے لاؤں گا۔ اس پہاڑ جیسے ہاتھی کی بجائے اگر بادشاہ مجھے دو ایک بوری گیہوں، چاول، جَو یا چنے وغیرہ کچھ بھی دے دیتا تو چند دن پیٹ بھر کر کھا تو لیتا اور کچھ دن سُکھ کا سانس بھی لے لیتا۔ یہ تو اور بھی میرا جینا حرام کر دے گا۔ یہی سوچتے سوچتے میراثی بے چارہ رونے لگا۔

رو دھو کر جب اس کے دِل کا بوجھ کسی قدر ہلکا ہو گیا، تو ہاتھی کو پُچکارتے ہوئے بولا۔

"ہاتھی بھائی! بادشاہ تو میرے دل کا حال نہیں جان سکا۔ اور نہ میں ہی اُسے بتانے کی ہمت کر سکا۔ تمہیں میں اپنے دِل کا حال سُناتا ہوں۔ میری بات گرہ باندھ لینا۔ جو خود بھٹک رہا ہو، وہ کسی دوسرے کو راستہ کیا دِکھائے۔ میرے پاس اپنے کھانے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ پھر تمہیں کہاں سے کھلاؤں۔ ذرا ہمت سے کام لینا پڑے گا۔ میرے پاس ایک فالتو ڈھول

پڑا ہے۔ وہی میں تمہیں دے دیتا ہوں۔ میری طرح گا بجا کر تم بھی اپنی روزی روٹی کا سامان کرو۔ کھاؤ پیو اور جہاں جی چاہے سو رہو۔ میرے اُوپر بوجھ نہ بنو۔"

یہ کہہ کر اپنی جھونپڑی کے اندر گیا اور وہی بڑا سا ڈھول لا کر ہاتھی کے گلے میں باندھ دیا۔ پھر ایک تھیلا بھی ڈھول کے ساتھ لٹکا دیا اور ہاتھی کو اپنے ساتھ لے کر بازار کی طرف چل پڑا۔ بازار میں جا کر شاہی ہاتھی کا رسّا ہاتھ سے چھوڑتے ہوئے بولا۔

"لو، میاں ہاتھی! خدا حافظ۔ اب تم خود ہی کماؤ اور کھاؤ۔"

ہاتھیوں کو کان ہلاتے رہنے کی عادت تو ہوتی ہی ہے۔ اس شاہی ہاتھی نے بھی اپنے کان ہلانے شروع کیے تو اُن کی چوٹ ڈھول پر کچھ اس انداز سے پڑی کہ ڈھول میں سے ڈھم ڈھم کی آواز پیدا ہونے لگی۔ لوگوں نے ہاتھی کو ڈھول بجاتے دیکھا تو بہت خوش ہوئے۔ اور خوشی خوشی ڈھول کے ساتھ لٹکے ہوئے تھیلے میں پیسے بھی ڈالنے لگے۔ آگے آگے ہاتھی اپنے کانوں سے ڈھول بجاتا جا رہا تھا اور پیچھے پیچھے لوگوں کا ایک بڑا ہجوم یہ عجیب تماشا دیکھ رہا تھا۔ یہی تماشا جب بادشاہ کے ایک جاسوس نے دیکھا تو وہ بھاگا بھاگا دربار میں پہنچا اور بادشاہ کو بتانے لگا کہ حضور! میراثی نے تو آپ کے ہاتھی کو بھی فن کار بنا دیا ہے۔ وہی ہاتھی ایسا بڑھیا اور خوش آہنگ ڈھول بجا رہا ہے کہ لوگوں کا ایک بڑا ہجوم اس کا شیدائی بن گیا ہے۔ ہاتھی اب اپنے شیدائیوں کو لیے غالباً اس محل کی طرف آ رہا ہے۔ ذرا دیکھیے تو کیا عجیب نظارہ ہے۔

یہ سُن کر بادشاہ بھی محل سے باہر نکل آیا۔ دیکھا تو واقعی سُنی ہیں

جھومتا ہوا شاہی ہاتھی ڈھول بجاتا چلا آرہا ہے۔ اور اس کے پیچھے بے شمار لوگ اُس کا تماشا دیکھتے آرہے ہیں۔ بادشاہ نے فوراً ایک پیادہ بھیج کر میراثی کو طلب کیا۔ میراثی بادشاہ کے سامنے پیش ہوا تو بادشاہ نے پُوچھا۔

"میر بھائی! اس میں شک نہیں کہ تم سچ مچ ایک بڑے فن کار ہو۔ راتوں رات اتنے بڑے جانور کو بھی کس خوبی سے اپنا فن سکھا دیا ہے اور مَیں دیکھ رہا ہوں کہ اب یہ بہت اچّھا ڈھول بجانے لگا ہے۔ لیکن اتنے بڑے ہاتھی کو بھرے بازار میں کھُلا کیوں چھوڑ رکھا ہے۔ اگر یہ کسی کو ہلاک کر دے تو۔ ۔ ۔!"

میراثی نے اب کے بغیر کسی تکلّف کے صاف صاف جواب دیا۔

"حضور! سچ تو یہ ہے کہ میرے لیے یہ فن سے زیادہ پیٹ کی مجبوری ہے۔ دراصل میرے پاس اپنے کھانے کو کچھ نہ تھا۔ اِسی لیے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ آپ کا شُکر گزار ہوں۔ کہ حضور نے میرے گانے بجانے کی قدر کی۔ اور خوش ہو کر ناچیز کو انعام کا مُستحق سمجھا۔ اور پہاڑ جتنا بڑا یہ ہاتھی تو مجھے شاہی انعام کے طور پر دے دیا مگر اس کے کھانے پینے اور رکھنے کے لیے جگہ کا کوئی مناسب بندوبست نہیں کیا۔ جس کے پاس اپنے کھانے کے لیے کچھ نہ ہو وہ اتنے بڑے ہاتھی کی حفاظت بھلا کیسے کر سکتا ہے۔ خود تو ڈھول بجا کر کسی نہ کسی طرح اپنا پیٹ پالتا تھا۔ اس کے سوا میرے پاس چارہ بھی کیا تھا۔ ایک ڈھول اس کے گلے میں بھی باندھ دیا اور اس کی منت سماجت کی کہ "لو، میاں! میرے اُوپر بوجھ نہ بنو۔ خود کماؤ، کھاؤ اور جہاں جی چاہے سو رہو۔"

میراثی کی دُکھ بھری داستان سُن کر بادشاہ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ بادشاہ اب اس کی دُکھتی رَگ کو پہچان گیا تھا۔ اس نے حکم دیا کہ ہاتھی کے گلے سے ڈھول اُتارا جائے اور اس ہاتھی کو فوراً شاہی فیل خانہ میں باندھ دیا جائے۔ اس کے بعد میراثی کو بُلا کر بہت سا غلہ اور کھانے پینے کا سامان دیا اس کے علاوہ اس قدر نقد انعام دیا کہ اس کی گزر بسر بخوبی ہو سکے۔ اور کچھ سالانہ وظیفہ بھی مقرر کر کے بادشاہ نے میراثی کے دُکھ کا مستقل علاج کر دیا۔

جُوتوں کی کرامات

میاں مچھندر کا اصلی نام تو کچھ اور ہی تھا لیکن یہ خطاب انھیں ان کی بڑی بڑی مُونچھوں کی وجہ سے دیا گیا تھا۔ اور اب وہ اسی نام سے مشہور تھے۔ پیشے کے اعتبار سے وہ ایک عطر فروش تھے۔ اُن کی دوکان میں بڑھیا سے بڑھیا خوشبوؤں اور عطروں کی بے شمار شیشیاں سجی رہتی تھیں، اور دوکان پر بھی ہر وقت گاہکوں کا میلا سا لگا رہتا تھا۔ ان ہی گاہکوں کی بدولت میاں مچھندر کی تجوری ہمیشہ بھری رہتی تھی۔ ان کو اپنے کاروبار میں دن دونی رات چوگنی ترقّی کرتے دیکھ کر شہر بھر کے دولت مند اور اُن کے ہم پیشہ لوگ ہمیشہ حسد کی آگ میں جلتے رہتے تھے۔ اور ہر وقت اسی تاک میں رہتے تھے کہ کسی طرح انھیں میاں مچھندر کو نیچا دِکھانے کا موقع ہاتھ لگے۔

ادھر میاں مچھندر جتنے بڑے دولت مند تھے اس سے کہیں زیادہ کنجوس، مکّھی چوس بھی تھے۔ نہ اچھا کھاتے اور نہ ڈھنگ کے کپڑے پہنتے تھے۔ بس ہر وقت دولت جمع کرنے کے چکّر میں رہتے تھے۔ یہی لالچ اور کنجوسی انھیں لے ڈوبی۔ ان کے بے ڈھب کپڑوں کا ذکر تو درکنار، جُوتے تک کسی تعارف کے محتاج نہ تھے، جو شہر کے غالباً تمام موچیوں کی زیارت کر چکے تھے۔ تلوں میں چھید اور اُن چھیدوں میں وزنی کیلوں کا شمار کسی کیلکو لیٹر (Calculator)

کی مدد کے بغیر ممکن نہ تھا۔ جوتوں کے اُوپری حصّے پر بھی اس طرح سے پیوند پر پیوند سجا رکھتے تھے کہ گینڈا بھی اپنی کھال کا مقابلہ ان جوتوں کے چمڑے سے کرکے شرما جاتا تھا۔ خوشبوؤں کے تاجر کے یہ جوتے بدبو میں قدم اُٹھانا مشکل ہو جاتا۔ مگر یہ میاں پھندر کی ہمت تھی کہ انھیں برابر گھسیٹتے جا رہے تھے۔ غرض میاں پھندر کے جوتے دُنیا میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ اب ان کی حیثیت آثارِ قدیمہ کی سی ہو گئی تھی۔ مگر میاں پھندر تھے کہ کسی بھی طرح ان آثارِ قدیمہ سے ناتا توڑنے کے لیے تیار نہیں تھے۔

اتفاق سے ایک دن ایک بچپن کے دوست ان سے مِلنے آگئے۔ دونوں دوست ایک دوسرے سے مِل کر بہت خوش ہوئے۔ باتوں باتوں میں دوست کی نظر ان کی جوتوں پر پڑی تو کہنے لگے۔ بھائی جان! ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے۔ اور اس مخصوص حد کو پار کرنا خطرناک بھی ہو سکتا ہے۔ تمہارے جوتے بھی اس حد کو پار کر چکے ہیں، اب انھیں ریٹائر کر دینا ہی بہتر ہے۔ اگر ایسا کرنا آپ کو گوارا نہیں تو میری مانو، آج کل شہر میں ایک شان دار عالمی میلا لگ رہا ہے۔ انھیں وہیں نمائش کے لیے بھیج دو۔ ارے بھائی! اگر اپنا نہیں تو کچھ بزرگوں ہی کی عزّت کا لحاظ رکھو۔ وہ تو نہایت عمدہ کپڑے اور بڑے نفیس جوتے پہنا کرتے تھے۔

شرمندہ ہونے کی بجائے میاں پھندر بڑے فخر سے بولے۔ "لگتا ہے آپ نے ان جوتوں کو پہچانا ہی نہیں۔ ارے یار! یہی تو وہ جوتے ہیں، جو دادا جان پہنا کرتے تھے۔ بزرگوں کی اس نشانی کو جیتے جی اگر اپنے سے جدا کر دوں تو قیامت کے دن انھیں کیا منھ دکھاؤں گا۔"

"تو پھر قیامت کا انتظار نہ کرو۔ اگر تم نے اپنا خیال نہ بدلا تو یہ جوتے

تمہارے لیے یہیں قیامت برپا کر دیں گے۔ اچھا! اجازت دو۔ مجھے کچھ ضروری کام ہے۔ پھر کبھی ملیں گے۔" دوست نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

الوداع کہنے کے لیے میاں مچھندر بھی تھوڑی دُور تک اپنے دوست کے ساتھ ہولیے۔ چلتے چلتے جب وہ شاہی مسجد کے پاس ایک حمام کے قریب پہنچے تو میاں مچھندر نے کہا۔ "اچھا! پھر تشریف لائیے گا۔ اب مَیں اسی حمام میں نہا کر سیدھے دوکان پر پہنچ جاؤں گا۔" دوست شاید ابھی کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ اس نے جُوتے اُتارے اور حمام میں داخل ہوگیا۔ اور دوست نے اپنی راہ لی۔

اتنے میں حمام کی صفائی کرنے والا بھی پہنچ گیا۔ اس نے دیکھا کہ کتنے گندے اور بدنما جُوتے حمام کے سامنے پڑے ہیں۔ اگر قاضی صاحب نے دیکھ لیا تو کیا کہیں گے۔ یہی سوچ کر اس نے وہ جُوتے اُٹھائے اور حمام سے دُور ایک کونے میں رکھ دیے۔ قریب ہی ایک خوب صورت سلیم شاہی جُوتا رکھا تھا۔ جو صفائی کے دوران سرکتے سرکاتے میاں مچھندر کے حمام کے سامنے آگیا تھا۔ میاں مچھندر نہا دھو کر باہر نکلے تو اپنے بدنما جُوتوں کی جگہ خوب صورت سلیم شاہی جُوتے پڑے پائے۔ سوچا کہ یہ دوست بھی کیا عجیب آدمی ہے۔ ایک آنکھ نہیں بھاتے تھے وہ جُوتے اُسے۔ آخر انھیں بدل کر ہی دم لیا ہے اس نے۔ یہی سوچ کر بے تکلّف نئے جُوتے پہنے اور دوکان کی طرف چل دیے۔

اتفاق سے ساتھ والے حمام میں قاضی صاحب خود بھی نہا رہے تھے۔ اور وہ سلیم شاہی جُوتے انھوں نے اسی دن نئے خریدے تھے۔ جب وہ نہا کر باہر نکلے تو جُوتے ندارد۔ بہت خفا ہوئے۔ صفائی والا اپنی غلطی پر پردہ ڈالنے کی غرض سے کچھ نہ بولا۔ قاضی صاحب کے جُوتوں کی چوری کوئی معمولی بات نہ تھی۔ بہت

سے لوگ جمع ہو گئے۔ تلاشں کرنے پر بھی اُن کا جُوتا تو کہاں سے مِلتا۔ البتہ میاں چھندرے کے لاثانی جُوتے برآمد ہو گئے۔ کچھ لوگ ان جُوتوں سے اچھی طرح واقف تھے۔ لہٰذا چور کا پتہ لگانے میں زیادہ دُشواری نہ ہوئی۔ کچھ لوگ فوراً میاں کی دوکان پر پہنچے اور جُوتوں سمیت اُنھیں قاضی صاحب کے پاس پکڑ لائے۔ قاضی صاحب نے اپنے جُوتے پہچان لیے۔ چور رنگے ہاتھوں پکڑا جائے تو کسی گواہ یا ثبوت کی ضرورت کیوں ہو۔ چوری کے جُرم میں تین ماہ سزائے قید بامشقت سُنائی گئی۔ نئے جُوتے اُتروا کر وہی پُرانے جُوتے انھیں تھما دیے گئے۔ چھندرے بے چارے بہت چلاّئے کون سُنتا۔ لاچار جیل کی ہوا کھانی پڑی۔

جیل کے اندر کبھی وُہ اپنے جُوتوں کو دیکھتے اور کبھی اپنے دوست کی باتیں یاد کرکے پچھتاتے۔ "اگر تم نے اپنا خیال نہ بدلا۔ تو یہ جُوتے تمھارے لیے یہیں قیامت برپا کر دیں گے۔" دوست ٹھیک ہی کہتا تھا۔ جیل کی مُصیبت بھی تو قیامت سے کم نہیں۔ خُدا خُدا کرکے جیل سے رہا ہوئے تو زندگی میں پہلی بار انھیں خود بھی یہ جُوتے بُرے لگنے لگے۔ پاؤں میں پہننے کی بجائے جُوتے بغل میں دبائے اور چل دیے۔ راستے میں ایک نہر بہتی تھی نفرت اور غُصّے سے وہ جُوتے اسی نہر میں پھینک دیے۔ اور گھر کا راستہ لیا۔ سوچتا تھا کہ "اب تو اِس مُصیبت سے چھٹکارا پا جاؤں گا۔ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ اب تو آرام سے رہوں گا۔"

خُدا کی قدرت وہاں سے کچھ دُور اسی نہر کے پانی سے ایک پن چکّی چلتی تھی۔ بہتے بہتے وہ جُوتے وہاں پہنچ گئے۔ اور پن چکّی کے پاٹوں میں جا پھنسے۔

تڑاخ سے ایک آواز آئی اور رہٹ ٹوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا۔ کارندوں نے جاکر پن چکّی کے مالک کو بتایا، تو وہ پریشان حال پن چکّی پر پہنچا۔ چکّی کو کھول کر دیکھا تو بھاری بھرکم جوتے پاٹوں میں پھنسے ہوئے ہیں۔ وہ جوتے اٹھاکر قاضی کے پاس فریادی ہوا۔ اور فریاد کی کہ حضور ان جوتوں نے میری پن چکّی کا ستیاناس کر دیا ہے۔ میں برباد ہوگیا۔ میرے بیوی بچوں کی روزی روٹی کا کیا ہوگا۔ یہی جوتے ایک بار پہلے بھی عدالت میں پیش ہو چکے تھے۔ لوگوں کو بلکہ خود قاضی تک کو انھیں پہچاننے میں دیر نہ لگی۔ قاضی کے حکم سے لوگ میاں مچھندر کو پھر عدالت میں کھینچ لائے۔ اب کے قاضی نے ان پر ڈبل جرمانہ کیا۔ اور حکم سنایا کہ میاں مچھندر چکّی کو نئے سرے سے فوراً چالو کریں۔

میاں مچھندر کو جب اپنے کئی مہینوں کے گاڑھے پسینے کی کمائی، پن چکّی کو چالو کرنے کی بھینٹ چڑھانی پڑھی، تو وہ جوتے اور بھی اس کی آنکھوں میں کھٹکنے لگے۔ اس نے سوچا کہ نہر کا پانی شاید اتنا گہرا نہیں تھا۔ اس لیے وہ انھیں ہضم نہیں کر سکا۔ اب انھیں کہیں ایسے گہرے پانی میں پھینکوں گا جہاں سے ان کے لیے پھر اس دنیا میں لوٹنا ناممکن ہو۔

رات تھی کہ ختم ہونے میں نہیں آتی تھی۔ منھ اندھیرے ہی اس نے جوتوں کو اٹھایا اور دریا کی طرف چل دیا۔ دریا پر پہنچ کر پہلے تو گڑگڑایا۔ "اے خواجہ خضر! ان جوتوں نے میرا ناک میں دم کر رکھا ہے۔ اے میرے مولا مشکل کشا! میری یہ مشکل حل کر دیجیے۔ میں انھیں آپ کے سپرد کرتا ہوں۔ آپ انھیں کسی ایسی جگہ غرقاب کر دیجیے کہ پھر کبھی اس دنیا میں نظر نہ آئیں"۔ یہ کہتے ہوئے وہ

جُوتوں کو دریا میں پھینک آیا۔ ابھی وہ گھر بھی نہ لوٹا کہ کچھ مچھیرے وہاں پہنچ گئے۔ اور مچھلیاں پکڑنے کے لیے انھوں نے جال دریا میں پھینک دیا۔ تھوڑی ہی دیر میں انھوں نے محسوس کیا کہ شاید کوئی اچھا شکار ہاتھ لگ گیا ہے۔ جال کافی بھاری ہوگیا تھا۔ زور لگا کر نکالا۔ دیکھا تو مچھلی کی جگہ بدنما جُوتے جال میں پھنسے ہوئے ہیں۔ ان طلسماتی جُوتوں کو پہچاننے میں انھیں کوئی دیر نہ لگی۔ سوچا شگون اچھا نہیں ہوا۔ جب تک یہ جُوتے آنکھوں کے سامنے رہیں گے کوئی مچھلی نہیں پھنسے گی۔ جال وغیرہ وہیں چھوڑ کر ان میں سے دو مچھیرے گئے اور روشن دان کے راستے ان جُوتوں کو میاں پھندر کی دوکان میں پھینک آئے۔ جُوتے ٹھیک گلاب کی شیشیوں پر گرے اور تمام شیشیاں چکنا چُور ہوگئیں۔ میاں جب اپنی دوکان پر آئے تو دیکھا کہ دوکان معمول سے زیادہ مہک رہی ہے۔ شیشیاں سب ٹوٹی پڑی ہیں۔ اور اس کے وہی منحوس جُوتے گلاب کے عطر میں غوطے لگا رہے ہیں۔ یہ دیکھ کر اس کا دل بھر آیا۔ سوچنے لگا کہ کم بخت جُوتے مجھے کہیں کا نہیں رہنے دیں گے۔ کروں تو کیا کروں اور جاؤں تو کہاں جاؤں۔ یہ بلا گھر میں رہی تو گھر میں بھی اُلّو بولنے لگیں گے۔ دوکان سے تو بعد میں نپٹ لوں گا پہلے انھیں کہیں ٹھکانے لگا آؤں۔ یہی سوچ کر اُس نے دوکان بند کی اور جوتے ہاتھ میں اُٹھا کر شہر سے دُور کسی انجان جگہ کی طرف چل دیا۔ شہر سے کافی دُور پانی کا ایک بڑا حوض دِکھائی پڑا۔ سوچا، یہی وہ مناسب جگہ ہے جہاں یہ کسی کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے اور کچھ ہی دنوں میں گل سڑ جائیں گے۔ جُوتے حوض میں ڈال کر اُلٹے پاؤں دوکان پر چلا آیا۔

بے چارے میاں کو کیا معلوم تھا کہ یہی وہ حوض ہے جس کے ذریعے شاہی محلوں میں پانی پہنچایا جاتا ہے۔ حوض میں گرتے ہی وہ پانی کے نلوں

میں جا گھسے۔ ہر طرف شور مچ گیا۔ کہ شاہی محلوں کے نلوں میں پانی کا آنا بند ہو گیا ہے۔ فوراً چھان بین شروع ہو گئی۔ آب رسانی کے لیے ذِمّہ دار لوگ لنگر لنگوٹ کس کر حوض میں کود پڑے۔ اور غوطے لگا لگا کر نلوں کا جائزہ لینے لگے۔ کافی دوڑ دھوپ کے بعد پتہ چلا کہ کوئی چیز نلوں میں اٹکی ہوئی ہے۔ جب اسے نکالا گیا تو وہ میاں پھندر کے جوتے تھے۔ پھر کیا تھا۔ حکم ہوا میاں پھندر کی مشکیں باندھ کر انھیں فوراً کچہری میں پیش کیا جائے۔ جب وہ کچہری میں پیش ہوئے تو پولیس نے پہلے تو ان کی خوب خاطر تواضع کی۔ یہی جوتے جو کبھی ان کے پیروں کی زینت ہوا کرتے تھے، آج بے چارے کے سر پر پڑ رہے تھے۔ جیل کی سزا سے تو بچ گئے لیکن بھاری جُرمانہ ادا کرنے کے بعد کہیں رہائی پا سکے۔

رسوائی کی اس منزل پر پہنچ کر میاں پھندر کو محسوس ہوا کہ شاید پانی کو بھی ان جوتوں سے الرجی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی بھی جگہ کا پانی انھیں قبول نہیں کرتا۔ چنانچہ اب انھوں نے فیصلہ کیا کہ پانی میں پھینکنے کی بجائے کسی مناسب جگہ پر گڑھا کھود کر اگر انھیں دفن کر دیا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا۔ اس طرح سے یہ تا قیامت وہیں دبے پڑے رہیں گے۔ اسی خیال سے سرِ شام اس نے جوتے بغل میں دبائے، کدال کندھے پر رکھی اور ایک باغ میں جا پہنچے۔ گڑھا کھودنا شروع کیا تھا کہ ایک چغل خور نے پولیس میں جا کر چغلی کھائی کہ میاں پھندر نے کسی کو قتل کر دیا ہے۔ اور اب وہ فلاں باغ میں گڑھا کھود کر اس کی لاش کو دفن کر رہا ہے۔ تھانے دار صاحب اپنے کچھ عملے کے ساتھ فوراً اسی باغ میں آدھمکے۔ جوتوں کو مٹّی دے کر میاں جی ابھی کدال بھی نہ سنبھال پائے تھے کہ گرفتار کر کے انھیں کوتوال کے پاس لے گئے۔ بے چارے بہت روئے چلائے کہ میں نے کسی کی جان نہیں لی۔ بلکہ وہاں پر اپنے منحوس جوتوں کو دفن کیا

ہے۔ مگر نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سُنتا ہے۔ خوب دُھنائی ہوئی۔ آخر رشوت دے کر جب اس نے پولیس کو موقع دیکھنے پر راضی کیا بھی تو پولیس نے باغ میں جُوتوں کے مقبرے کی اجازت نہ دی۔ ناچار بلائے جان جُوتے پھر انھیں کے سر منڈھ دیے گئے۔ اور وہ گردن جھکائے بڑبڑاتے ہوئے پھر گھر کی طرف چل دیے۔

اب میاں مچھندر نے دل ہی دل میں یہ طے کر لیا کہ نہ تو وہ انھیں کہیں پھینکے گا اور نہ ہی دفن کرے گا بلکہ مٹّی کا تیل چھڑک کر آگ لگا دے گا۔ اس طرح جل کر جب یہ راکھ ہو جائیں گے تو وہ بھی چین کی نیند سو سکے گا۔ جلنے کے لیے کسی چیز کا اچھی طرح سے سُوکھا ہوا ہونا ضروری ہے۔ چنانچہ سُکھانے کے لیے انھوں نے جُوتوں کو چھت کی مُنڈیر پر رکھ دیا۔ شامتِ اعمال سے ایک بلّی مُنڈیر پر سے گزرنے لگی تو جُوتے لڑھک کر مکان کے پچھواڑے سڑک پر جا پڑے۔ اتفاق سے وہاں ایک بُڑھیا کھڑی تھی۔ جُونہی کیل دار وزنی جُوتے بُڑھیا کی چندیا پر پڑے تو اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ سر چکرانے لگا جب ذرا ہوش میں آئی تو کئی تماشہ دیکھنے والے جمع تھے۔ انھوں نے وہ جُوتے اُٹھائے اور بُڑھیا کے سر پر کپڑا باندھے قاضی کے پاس لے گئے۔ بُڑھیا نے فریاد کی۔ جُوتے دیکھتے ہی قاضی نے پہچان لیا کہ یہ تو اسی میاں مچھندر کے جُوتے ہیں۔ میاں مچھندر کی گرفتاری کے وارنٹ پھر جاری کر دیے گئے۔

جنگل کی آگ کی طرح شہر بھر میں یہ خبر پھیل گئی کہ میاں مچھندر پھر پکڑے گئے ہیں۔ لوگ تماشہ دیکھنے کے لیے جمع ہو گئے۔ قاضی صاحب نے گرجتے ہوئے کہا "میاں تمھارے جُوتوں نے قیامت برپا کر رکھی ہے۔ شہر بھر کا ناک میں دم کر دیا ہے۔ نت نئے شگوفے چھوڑنا بند نہیں کرو گے تو عمر قید کی سزا پاؤ گے۔ اسی آخری تنبیہہ کے ساتھ تمھیں صرف ایک ہزار روپے جُرمانا کر کے چھوڑ رہا ہوں۔

میاں مچھندر نے اسی وقت جرمانے کی رقم کی ادائیگی کا انتظام کیا اور رقم ادا کر کے اس نے دونوں جوتوں کو ہاتھوں میں اُٹھایا اور ایک اونچی جگہ پر جا کر کھڑا ہو گیا اور قاضی سمیت تمام حاضرین کو مخاطب کر کے بولا: "میرے محترم دوستو! یہ منحوس جوتے بُری طرح سے میرے گلے کا ہار بن گئے ہیں۔ میں نے انہیں نہر میں ڈالا۔ دریا میں پھینکا، حوض میں ڈبویا۔ زمین میں دفن کیا مگر کسی نے بھی انہیں قبول نہیں کیا۔ یہ بُری طرح میرے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ جونک کی طرح چمٹ کر میرا خون چوس رہے ہیں۔ انھوں نے مجھے جیل کی ہوا کھلائی۔ جرمانہ ادا کرتے کرتے میرا دِوالہ نکل گیا۔ مزید مار کھانے کی مجھ میں ہمت نہیں رہی۔ چنانچہ اب میں قبلہ کی طرف منھ کر کے خدا کو حاضر ناظر سمجھتے ہوئے آپ سب لوگوں کے روبرو اس معزز عدالت میں حلفیہ بیان دیتا ہوں کہ آج سے ان جوتوں کے ساتھ میرا کوئی واسطہ نہیں رہا۔ آئندہ یہ کوئی بھی جرم کریں، اس کی ذمہ داری مجھ غریب پر عاید نہ کی جائے۔ بلکہ معزز عدالت اور یہ کراماتی جوتے معاملے کو آپس ہی میں نمٹا لیا کریں۔ اسی کے بعد اس نے جوتوں کو وہیں پھینکا اور سر پر پاؤں رکھ کر ایسا بھاگا کہ گھر آکر ہی دم لیا۔

انسانیت کا کمال

مُلک کے سرحدی علاقے میں رام گڑھ نام کا ایک قصبہ تھا۔ اس قصبے کے چاروں طرف ہریالی ہی ہریالی تھی۔ ہر طرف ہرے بھرے کھیت لہلہاتے تھے۔ کھیتوں سے دُور مغرب کی طرف کچھ گھنی جھاڑیاں بھی صاف دِکھائی پڑتی تھیں۔ کھیتوں میں پیداوار اچھی ہونے کی وجہ سے لوگوں میں خوش حالی پائی جاتی تھی۔ لوگ صبح و شام قدرت کے خوب صورت نظاروں سے لُطف اُٹھاتے تھے اور بے فکری سے خوشی کے گیت گاتے تھے۔

قصبے کے لوگوں کی حفاظت کے لیے گھنی آبادی سے ذرا پرے سرکار نے ایک پولیس چوکی بھی قایم کر رکھی تھی۔ اس چوکی کا تھانے دار چودھری دِلاور خان اپنے فن کا پکا، ملن سار، نوجوان اور جوشیلا پولیس افسر تھا۔ اس کا دل وطن کی محبّت سے سرشار تھا۔ تھانے کے پاس ہی تھانے دار کی رہائش کے لیے ایک چھوٹا سا بنگلہ تھا جس میں تھانے دار چودھری دِلاور خاں اپنی بیگم سعیدہ خانم اور ایک پیارے سے گول مٹول بچّے "بیٹو" کے ساتھ رہتا تھا۔

خاں صاحب کو پھلوں اور پھولوں سے بہت محبّت تھی۔ اپنی ڈیوٹی سے فارغ ہو کر وہ سیدھے گھر آجاتا، آکر صحن میں کیاریاں بناتا، پھول اور پھل دار پیڑ پودے لگاتا، ان کی سینچائی کرتا اور ایک اچھے باغ بان کی طرح کھُرپی لے کر

ان پودوں کی نلائی بھی کرتا تھا۔ اس طرح اس کا صحن ایک اچھا خاصا دِل کش باغیچہ بن گیا تھا۔ جس سے آنے والی بھینی بھینی خوشبو کی لپٹیں دُور دُور تک پھیلی رہتیں اور آنے جانے والوں کے دِلوں کو لُبھاتی تھیں۔

چودھری دِلاور خاں خود بھی قصبے کے لوگوں میں بڑا ہر دِل عزیز تھا۔ وہ علاقے کے ہر مذہب اور مِلّت کے لوگوں سے بڑی رواداری اور فراخ دِلی سے پیش آتا اور وقت پڑنے پر اپنی جان پر کھیل کر بھی ان کی مدد کرنے کو تیّار رہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ قصبے کے سبھی لوگ اسے دل و جان سے چاہتے اور اس کی عزّت کرتے تھے۔

ایک بار پولیس کا ایک گشتی دستہ جب جھاڑیوں میں سے گزر رہا تھا تو اس کی نظر دو آدمیوں پر پڑی جو جھاڑیوں کے پیچھے چھُپے کسی سے وائرلیس پر باتیں کر رہے تھے۔ پولیس نے ان دونوں کو جاسوسی کے الزام میں گرفتار کر کے تھانے دار کے سامنے پیش کر دیا۔ سرسری تفتیش کے بعد ان کے وائرلیس سیٹ بھی برآمد کر لیے گئے۔ تھانے دار نے انھیں فوراً حوالات میں بند کر دیا اور مزید جانچ پڑتال کے لیے معاملے کی رپورٹ قریبی شہر کے بڑے تھانے کو بھیج دی۔ بڑے تھانے نے ہدایت دی کہ چار پانچ دن تک انھیں وہیں اپنی کڑی نگرانی میں رکھا جائے۔ اسی دوران کسی بھی دن پولیس کا ایک دستہ بھیجا جائے گا جو ان مُلزموں کو شہر کے بڑے تھانے میں لے جائے گا۔

مُلزموں پر چونکہ کڑی نگرانی کی ہدایت دی گئی تھی۔ اس لیے فرض کا احساس کرتے ہوئے تھانے دار چودھری دلاور خاں خود بھی اکثر دیر تک تھانے ہی میں موجود رہتا۔ مُلزموں کو گرفتار کیے ابھی دوسرا ہی دن تھا کہ شام کے جھٹپٹے میں اس کی بیگم نیم پاگلوں کی طرح ہڑبڑائی ہوئی تھانے میں آئی اور سیدھے

تھانے دار صاحب کے کمرے میں جا پہنچی جہاں وہ اپنے ضروری کاموں کو نپٹانے میں مصروف تھے۔ بیگم پہلے کبھی اس طرح تھانے میں نہیں آئی تھی۔ اچانک اسے اپنے سامنے دیکھ کر خان صاحب شش و پنج میں پڑ گئے۔ اس سے پیشتر کہ وہ کچھ پوچھتے بیگم کھڑی کھڑی سسکیاں بھرنے لگی اور رندھی ہوئی آواز میں بمشکل تمام صرف اتنا ہی کہہ پائی کہ "بیٹو نہ جانے کہاں غائب ہو گیا ہے"۔

کیا؟ بیٹو ـــ غائب ہو گیا؟ کب، کیسے، کہاں ـــ دلاور خاں پر جیسے بجلی ٹوٹ پڑی ہو ایک ہی سانس میں اُس نے کئی سوال کر ڈالے۔ "کیا تم نے اسے پورے گھر میں تلاش کر لیا ہے؟"

"ہاں! میں نے اپنا پورا گھر ہی نہیں بلکہ پاس پڑوس بھی چھان مارا ہے۔ کہیں نہیں ملا"۔ بیگم نے کہا۔

"تو پھر وہ گیا کہاں؟ اور تم کہاں تھیں اس وقت" خان صاحب نے پُوچھا۔

"مجھے جانا ہی کہاں ہوتا ہے۔ بیٹو کو لے کر صحن کے باغیچے میں بیٹھی تھی۔ وہ رونے لگا تو اسے وہیں چھوڑ کر اس کے لیے دُودھ لینے صرف کچن تک ہی گئی تھی۔ واپس جا کر دیکھا تو وہ غائب تھا"۔ کہتے کہتے بیگم کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی سی لگ گئی۔

یہ سُنتے ہی خاں صاحب نے بیگم سے کہا "تم فوراً گھر چلو۔ میں بھی ابھی آتا ہوں"۔

اس کے بعد اس نے اپنے نائب تھانے دار کو بلایا اور نئے ملزموں کی سخت نگرانی کرنے کی تاکید کر کے فوراً اپنے بنگلے کی طرف بھاگا۔ گھر پہنچ کر اس نے خود بھی مکان کا کونہ کونہ چھان مارا لیکن بیٹو کہیں نہ ملا۔ اب تو تھانے دار کی آنکھوں میں

بھی آنسو آ گئے۔ وہ خود بھی تو ایک پولیس افسر تھا۔ بیٹو کے اچانک غائب ہونے کے راز کو بھانپنے میں اسے زیادہ دیر نہ لگی۔ پھر بھی بیوی کو دلاسا دیتے ہوئے بولا۔ "ذرا صبر سے کام لو۔ مل جائے گا اپنا بیٹو۔ اس طرح رونے سے کوئی فائدہ نہیں۔ ملک و قوم کے خادموں کو کچھ نہ کچھ قیمت تو چکانی ہی پڑتی ہے۔

بیگم نے بے چینی سے کہا۔ "ملک و قوم کی خدمت۔ ہم اور ہمارے بزرگوں نے ملک و قوم کے لیے کیا کچھ نہیں کیا؟ کون سی قیمت ادا نہیں کی۔ وہ جیل گئے۔ جائدادیں ضبط کرائیں۔ مالی اور جانی قربانیاں دیں اور ملک کی آزادی کے لیے۔ . . . کون سی کسر باقی چھوڑی تھی۔ پھر معصوم بچوں کو یوں اٹھالے جانا بھی کوئی بہادری ہے یہ ایک شرم ناک حرکت اور کمینہ پن ہے۔ ایسا کرنے والا چاہے کوئی بھی ہو۔

"تم تو پگلی ہو۔ تمہارے اس طرح کوسنے سے کمینے اپنا کمینہ پن نہیں چھوڑ دیں گے۔ سوچنے کی بات تو یہ ہے کہ آزادی صرف حاصل کر لینا ہی کافی نہیں ہوتا۔ اس آزادی کو برقرار رکھنا اور ملک کی حفاظت کرنا اس سے بھی کہیں زیادہ ضروری ہے۔ ایسے وقت میں فرض سے منہ موڑنا قوم فروشی سے کم نہیں۔ زندگی فرض کی ادائیگی ہی کا دوسرا نام ہے۔ جو شخص ملک و قوم کی زیادہ سے زیادہ خدمت کرتا ہے، اسے ہی زندہ رہنے کا زیادہ حق ہے۔ دعا کرو کہ اپنا بیٹو جلدی مل جائے۔ یہ چمن ان بلبلوں سے یونہی آباد رہے اور ان کے دم سے وطن بھی ہمیشہ سرسبز و شاداب رہے۔"

اتنے میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ دلاور خاں نے لپک کر ریسیور اٹھایا اور بولا۔ ہیلو!

"ہیلو! کیا خان صاحب تشریف رکھتے ہیں۔ مجھے ان سے کچھ ضروری کام ہے۔"

دوسری طرف سے آواز آئی۔

"جی! مَیں بول رہا ہوں۔ فرمائیے! آپ کون صاحب ہیں، اور کہاں سے بول رہے ہیں؟"

"یہ سب بتانا تو فی الحال مناسب نہیں ہوگا۔ آپ بتائیے۔ آپ کا بچّہ مل گیا کیا؟"

"ابھی ملا تو نہیں۔ مل جائے گا۔"

"اجی خاں صاحب! آبِ حیات کٹورے میں ہے اور آپ جان بوجھ کر پیاسے پھر رہے ہیں۔"

"مطلب؟ مَیں کچھ سمجھ نہیں سکا ہوں۔"

"مطلب بالکل صاف ہے۔ ہمدردی وہی کرتا ہے جو خود تکلیف میں ہوتا ہے۔ آپ ہمارے آدمیوں کو رہا کر دیں تو آپ کا بچّہ آپ کے پاس پہنچ جائے گا۔"

"تو گویا ہمارا بچّہ آپ کے پاس ہے۔ شُکر ہے خُدا کا، کچھ پتہ تو چلا۔ کیا آپ اسے یہاں پہنچا دیں گے یا مَیں خود آپ کی خدمت میں حاضر ہوں۔" دِلاور خاں نے کہا۔

"ہمیں آپ سے یہی امید تھی خاں صاحب! آخر ہمارے اور آپ کے بیچ مذہب کا ایک مقدس رشتہ جو ہوا۔ اور اس رشتے کا لحاظ ...... خُدا آپ کو توفیق دے آنے سے پہلے آپ ہمارے آدمیوں کو رہا کر دیجیے گا۔"

"معاف کیجیے، مطلب پرستی کے لیے آپ مجھے مذہب کے حِصار میں بند کرنا چاہتے ہیں۔ کتنی شرم ناک بات ہے یہ۔ مذہب اگرچہ ہر شخص کا ذاتی معاملہ ہے۔

پھر بھی ہندوستانیوں کی رگوں میں بہنے والا خون ایک ہے اسی لیے سبھی مذاہب کو مقدس سمجھ کر ہم سب کا برابر احترام کرتے ہیں۔ آپ کے آدمیوں کی رہائی اگر میرا ذاتی معاملہ ہوتا تو شاید کسی سمجھوتے کی گنجائش نکل آتی۔ لیکن جہاں وطن کی حفاظت کا سوال ہو وہاں سورج کے سامنے چراغ کی ناچیز ہستی کو کوئی اہمیت نہیں دے سکتا۔"

"رہنے دیجیے صاحب! ضرورت بڑے بڑے سرکشوں کے بل نکال دیتی ہے۔ جب صلح اور دوستی سے کام نہیں نکلتا تو آخری تدبیر جانی نقصان ہوتا ہے۔ سوچ لیجیے چیونٹی کی تباہی کے لیے شبنم بھی سمندر بن سکتی ہے۔"

"اس آگ میں کودنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ ابھی یہ جنگل شیروں سے بالکل خالی نہیں ہوا کہ گیدڑ دلیری دکھانے کی ہمت کریں۔ کان کھول کر سن لو۔ ان ملزموں کو میں کسی بھی قیمت پر نہیں چھوڑ سکتا۔" خان صاحب نے سختی سے جواب دیا۔

"ابھی تمہارے سر پر خدمت وطن کا بھوت سوار ہے۔ جب اس کا خمیازہ بھگتوگے تو عقل ٹھکانے آجائے گی۔ اگر یہ بات ہے تو تمہیں بھی تمہارا بچہ نہیں مل سکے گا۔" اس کے ساتھ ہی ٹیلی فون بند کر دیا۔

بیگم کرسی کے پیچھے کھڑی ساری باتیں سن رہی تھی۔ گھبرا کر بولی۔ "ہائے اللہ! تم نے یہ کیا غضب کر دیا۔ مجھے ڈر ہے کہ تمہاری اس سخت کلامی کے انتقام میں اب وہ میرے بیٹو کو ضرور کچھ تکلیف پہنچائیں گے۔"

"تمہیں کیسے بتاؤں بیگم کہ وہ میرے نہیں، میری قوم اور میرے

وطن کے دُشمن ہیں۔ انھیں ہرگز ہرگز معاف نہیں کیا جاسکتا چاہے میری اپنی جان بھی کیوں نہ چلی جائے۔" خاں صاحب نے سمجھایا۔

"لیکن میرا بیٹو!" ابھی بیگم اتنا ہی کہہ پائی تھی۔ کہ خاں صاحب نے چلّاتے ہوئے کہا۔

"کون بیٹو، وہی ہمارا اکلوتا بیٹا نا! مَیں اپنے ایک بیٹو کو بچانے کی خاطر قوم کے کروڑوں بیٹوں کو دہکتے ہوئے جہنّم کی آگ میں نہیں جھونک سکتا۔" خاں صاحب نے اپنا آخری فیصلہ سُنایا۔

اس رات میاں بیوی دونوں کو پل بھر کے لیے بھی نیند نہیں آسکی۔ صُبح ہوتے ہی دوسری طرف سے پھر بار بار ٹیلی فون آنے شروع ہو گئے۔ لیکن دلاور خاں نے اپنے فیصلے میں کوئی تبدیلی کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ آخر اسی آواز نے دھمکی دیتے ہوئے کہا۔" تھانے دار صاحب تمہیں آخری مرتبہ وارننگ دی جاتی ہے کہ ہمارے آدمیوں کو فوراً رہا کر دو، ورنہ بُری خبر سُننے کے لیے تیار ہو جاؤ۔"

یہ سُن کر تو خان صاحب کو بھی اپنے عزم کی لَو تھرتھراتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ تاہم ہوش و حواس قایم رکھتے ہوئے بولے "اگر صندل میں اتنی خوشبو نہ ہو تو وہ محض ایندھن ہے۔ پھر کہے دیتا ہوں کہ میرا فیصلہ اٹل ہے۔ مَیں مُلزموں کو کسی بھی قیمت پر نہیں چھوڑوں گا۔"

یہ سُن کر بیگم تو غش کھا کر گر پڑی۔ اور خان صاحب اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگے۔ بیگم کی طبیعت ابھی پوری طرح سنبھل بھی نہ پائی تھی کہ باہر سے کسی نے انھیں ایک پارسل نُما پیکٹ اندر بھیجا۔ اس سے

پہلے کہ وہ پتہ لگاتے کہ یہ کون دے گیا۔ دینے والا جا چکا تھا۔ بے چینی کے عالم میں دونوں نے اس پیکٹ کو کھولنا شروع کیا۔ پیکٹ کا کھلنا تھا کہ خان صاحب پر بھی سکتے کا عالم طاری ہو گیا۔ پیکٹ کے اندر ان کے لاڈلے بیٹو کی کٹی ہوئی اُنگلی دیکھ کر بیگم پھر غش کھا کر گر پڑی۔

مجبوری آدمی کو معذوری کی حد تک پہنچا دیتی ہے۔ اب کے تو خان صاحب کے بھی جی میں آئی کہ وہ قیدیوں کو رہا کر کے اپنے پیارے بیٹو کی جان بچالے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اس کے ضمیر نے یہ گوارا نہ کیا کہ وہ مُلک اور قوم سے غدّاری کرے۔ بیگم کو ذرا ہوش آیا تو اس نے بھی ملتجیانہ لہجے میں کہا۔ "خان صاحب! بھرے گھر میں بھلے ہی ایک دانے کی قدر نہ ہو لیکن جس کا گھر خالی ہو جائے وہی بہتر جانتا ہے کہ ایک دانا بھی کیا نعمت ہے۔ اب بھی قیدیوں کو چھوڑ دو۔ نہ جانے وہ ظالم میرے بیٹو کو کیسی کیسی تکلیفیں پہنچا رہے ہوں گے۔"

دِلاور خان نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا۔

"زخموں پر نمک نہ چھڑکو بیگم! کیا تم سمجھتی ہو کہ مجھے بیٹو سے ذرا بھی مُحبّت نہیں۔ خُدا کے لیے ایسا نہ کہو۔ میرا دل تو پہلے ہی پھٹا جا رہا ہے۔ لیکن مجبور ہوں۔ مُلک اور قوم سے غدّاری کر کے کلنک کا ٹیکہ اپنے ماتھے پر نہیں لگا سکتا۔"

اگلے دن جب دونوں قیدیوں کو پولیس کی گاڑی میں بٹھا کر شہر کے بڑے تھانے کے لیے روانہ کیا تو چودھری دِلاور خاں کو کچھ ایسا محسوس ہونے لگا جیسے اس کے دِل سے ذِمّے داری کا ایک بھاری بوجھ تو اُتر گیا ہے۔ لیکن اب اس کی جگہ بیٹے کی محبت کا سمندر شدّت سے ٹھاٹھیں مارنے

لگا ہے۔ جذبات قابو سے باہر ہوتے جا رہے تھے کہ اسی شام قریبی گاؤں کی ایک ندی میں کسی خوب صورت بچّے کی لاش تیرتی ہوئی پائی گئی۔ لوگوں نے دیکھا کہ اس معصوم بچّے کے ہاتھ کی ایک اُنگلی بھی غائب تھی۔ یہ دیکھ کر ایک بُزرگ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ آنسو پونچھتے ہوئے اس نے کہا۔ "واقعی پت جھڑ کے بغیر کسی بھی پیڑ پر بہار نہیں آسکتی۔ اپنے لیے جینا تو سبھی جانتے ہیں۔ لیکن چودھری دلاور خاں کی طرح ایک عظیم فرض کی تکمیل کے لیے لاثانی قربانی دے کر وطن کے لیے مرنا اور وطن کے لیے جینا ہی انسانیت کا کمال ہے۔

سیدھے اور چالاک

پُرانے زمانے کی بات ہے کہ ایک بہت نیک اور سیدھی سادی بُڑھیا تھی۔ اس کے دو بیٹے تھے۔ بڑا بیٹا بدلو کاروبار کے سلسلے میں کہیں پردیس چلا گیا تھا۔ چھوٹا بیٹا فضلو اس کے پاس رہتا تھا۔ وہی اس کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ ایک دن فضلو بیمار ہو گیا۔ بہت علاج معالجہ کرایا۔ لیکن کچھ فائدہ نہ ہوا اور آخر کار وہ اللہ کو پیارا ہو گیا۔

بُڑھیا بے چاری پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ بڑھاپے میں خدا نے اس بے چاری کا سہارا چھین لیا تھا۔ اب اس کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہ تھا۔ اس نے اپنے پردیسی بیٹے بدلو کو ایک خط کے ذریعے اپنی حالت اور فضلو کی موت کی خبر لکھوا بھیجی۔ اس سے پہلے کہ بدلو کی طرف سے کوئی جواب آتا، ایک دن ایک مسافر اس بڑھیا کے پاس آیا اور بولا "دادی اماں! میں بہت دور سے آیا ہوں۔ تھک کر چور ہو چکا ہوں۔ اوپر سے رات بھی ہونے کو ہے۔ اگر اجازت دو تو یہ رات میں آپ ہی کے گھر پر ٹھہر جاؤں"۔

"آؤ بیٹا! آؤ بیٹھو۔ کیا حرج ہے۔ رات ہی تو رہنا ہے۔ کون سا گھر اُٹھا کر لے جاؤ گے۔ کہاں سے آئے ہو تم"۔ بڑھیا نے پوچھا۔

"میں کسی دوسری دنیا سے آرہا ہوں دادی ماں! تھکے ہوئے مسافر نے

ایک لمبی سانس لیتے ہوئے کہا۔ سرسری طور پر دوسری دُنیا سے مُراد مُسافر کے لمبے سفر سے تھی۔ لیکن بُڑھیا کے دل و دماغ پر چونکہ بیٹے کی موت کا اثر تھا۔ اور اپنے دل کو سمجھانے کے لیے وہ بھی اکثر یہی کہا کرتی تھی کہ اس کا بیٹا اب دوسری دُنیا میں چلا گیا ہے۔ مسافر کی زبان سے دوسری دُنیا کا نام سُن کر فوراً اسے اپنے مرحوم بیٹے کی یاد آ گئی۔ اور ایک سرد آہ بھر کر بولی۔ "بیٹا کیا تم سچ مچ دوسری دُنیا سے آ رہے ہو؟ میرا بیٹا فضلو بھی پچھلے ہی مہینے دوسری دُنیا میں چلا گیا ہے۔ کیا وہ بھی تمہیں ملا ہے کبھی؟"

مُسافر بُڑھیا کی سادگی کو بھانپ گیا۔ اور بولا۔ "اوہ! وہ فضلو آپ کا بیٹا ہے دادی ماں! مَیں تو اُسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ مَیں اور وہ ایک ہی کوٹھری میں تو رہتے ہیں وہاں۔ بہت اچھا لڑکا ہے فضلو میاں۔"

بُڑھیا مُسافر کے اور بھی قریب آ کر بیٹھ گئی۔ اور حسرت بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پُوچھنے لگی۔ "کیسا ہے میرا فضلو؟ کیا کرتا ہے وہاں؟"

"کچھ خاص اچھا نہیں ہے۔ ابھی تو اسے کوئی ڈھنگ کا کام بھی نہیں مِلا ہے وہاں۔ بے چارہ بکریاں چرایا کرتا ہے۔" مُسافر نے کسی قدر اُداس سا ہو کر جواب دیا۔

"ہائے ہائے! غضب ہو گیا۔ میرا بیٹا بکریاں چراتا ہے۔ بے چارہ مارا مارا پھرا کرتا ہوگا بن میں پھرتا ہوگا۔ وہاں بھی آرام نصیب نہیں ہوا بے چارے کو۔" بُڑھیا نے بہت دُکھی ہو کر کہا۔

اُس کے دُکھ میں اور بھی اضافہ کرنے کے لیے مُسافر نے کہا "ہاں امّاں! بیچارہ سر جھاڑ، مُنہ پھاڑ مارا مارا پھرا کرتا ہے۔ کپڑے بھی تار تار ہو گئے ہیں بے چارے

ہے۔" یہ سُن کر بڑھیا کا دِل بھر آیا۔ "تم کب واپس جاؤ گے بیٹا" اُس نے مُسافر سے پوچھا۔

"بس پرسوں مجھے وہیں پہنچنا ہے اماں!" مُسافر نے جواب دیا۔

"تو پھر میرا ایک کام کر دو بیٹا! میرے پاس چالیس گز کپڑے کا ایک تھان رکھا ہے۔ تم وہ تھان اور کچھ روپے میرے فضلو کو دے دینا اور اس کے ساتھ پچاس روپے نقد مسافر کے حوالے کیے۔ مُسافر نے رات بڑے آرام سے گزاری اور صبح ہوتے ہی بڑھیا کا صفایا کر کے چلتا بنا۔

کچھ دنوں بعد بڑھیا کا بڑا بیٹا بدلو بھی پردیس سے لوٹ آیا۔ آتے ہی پہلے تو ماں بیٹا دونوں ایک دوسرے سے گلے مل کر خوب روئے۔ پھر فضلو کی اچانک موت پر افسوس ظاہر کیا۔ ایک دن باتوں باتوں میں ماں نے اپنے بیٹے کو بتایا کہ بیٹا جب تم نہیں آئے تھے تو دوسری دُنیا سے ایک آدمی ایک رات گزارنے ہمارے گھر آیا تھا۔ اُس نے تمہارے بھائی فضلو کے بارے میں مجھے سب کچھ بتایا۔ دوسری دُنیا میں وہ آدمی اور فضلو ایک ہی کوٹھری میں رہتے ہیں۔ بتا رہا تھا کہ فضلو ابھی تک تو بکریاں ہی چراتا ہے۔ بے چارے کے کپڑے بھی پھٹ گئے ہیں۔ میں نے ایک تھان کپڑا اور پچاس روپے نقد فضلو کے لیے اس کے ہاتھ بھیج دیے ہیں۔

یہ سُن کر بدلو چونک پڑا۔ گھاٹ گھاٹ کا پانی پی کر اب وہ اتنا سیدھا نہیں رہا تھا۔ اب وہ ایسی چال بازیوں کو خوب سمجھنے لگا تھا۔ بولا۔ اماں! تم تو واقعی بہت سیدھی ہو۔ بھلا دوسری دُنیا سے بھی کوئی واپس آتا ہے۔ زمانے کے ہیر پھیر نہیں سمجھتی ہو۔ بدلو کو رہ رہ کر اپنی ماں کی سادگی اور مسافر کی چالاکی پر غصہ آ رہا تھا۔ پھر کچھ سوچ کر بولا۔ "اچھا اماں! تم آرام سے گھر میں رہو۔ میں چلا۔

ناک کی سیدھ میں چلتا جاؤں گا اور اس وقت تک چلتا رہوں گا جب تک مجھے کوئی تم سے زیادہ سیدھا نہیں مل جاتے گا۔ اور پھر جب تک اس نقصان کو پورا نہیں کر لوں گا، گھر نہیں لوٹوں گا۔ یہ کہہ کر وہ ناک کی سیدھ میں چل دیا۔

دل ہی دل میں وہ کچھ منصوبے بناتا چلا رہا تھا۔ دُور سے ہی اُسے ایک گاؤں دِکھائی دیا۔ وہ سیدھا اسی طرف چلتا گیا۔ بستی سے باہر جب وہ ایک زمیندار کی حویلی کے پاس پہنچا تو رُک گیا۔ دیکھا کہ ایک خوب موٹی تازی بکری بندھی ہوئی ہے۔ پاس ہی اس کے تین خوب صورت میمنے بیٹھے ہیں۔ بدلو بھی وہیں گھٹنے ٹیک کر زمین پر بیٹھ گیا۔ اور لگا بکری کو جھک جھک کر سلام کرنے۔ کمرے کی کھڑکی سے زمیندار کی بیوی یہ سب تماشا دیکھ رہی تھی۔ اس نے نوکرانی کو بلا کر کہا۔ "ذرا باہر جاکر دیکھو تو کہ وہ آدمی ہماری بکری کو اس طرح جھک جھک کر سلام کیوں کر رہا ہے۔ نوکرانی نے جاکر پُوچھا۔" اے بھلے آدمی! یہ ہماری بکری تمہاری کیا لگتی ہے جو اسے اس طرح سے فرشی سلام کرتے جا رہے ہو۔" بدلو نے جواب دیا۔ "اے بی بی! اسی کی تلاش میں تو مارا مارا پھر رہا تھا۔ جسے تم بکری سمجھتی ہو وہی تو میری بیوی کی رشتے دار ہے۔ کل میرے لڑکے کی شادی ہے۔ سبھی رشتے داروں کو دعوت دی جا چکی ہے۔ صرف اسی ایک کا پتہ نہیں چلتا تھا۔ مَیں اسے بھی شادی میں آنے کی دعوت دینے آیا ہوں۔ اگر مالکن صاحبہ اجازت دیں تو میری اور میری بیوی کی طرف سے گزارش ہے کہ یہ بھی اپنے بال بچّوں سمیت شادی کی رونق بڑھانے کے لیے ضرور تشریف لائیں۔"

نوکرانی نے جا کر مالکن کو بتایا تو وہ خوب ہنسیں کہ یہ شخص بھی کتنا بے وقوف ہے جو ایک بکری جیسے جانور کو اپنی بیوی کی رشتے دار سمجھتا ہے۔ اور اپنے لڑکے

کی شادی پر مدعو کر رہا ہے۔ اچھا ہو گا کہ اسے اور بھی بے وقوف بنایا جائے تاکہ دوسرے لوگ بھی اس کی بے وقوفی پر ہنسیں۔ اس نے فوراً نوکرانی کے ذریعے کہلا بھیجا کہ اگر یہ اس کی رشتے دار ہے تو اس کے رشتہ داروں کی شادی میں شرکت کرنے پر ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ مگر اس بے چاری کو تمہارا گھر ڈھونڈنے میں دِقّت ہو گی، اس لیے بہتر ہو گا کہ تم اسے ابھی سے اپنے ساتھ لیتے جاؤ۔

مالکن نے نوکرانی کو حکم دیا کہ ہماری بکری صاحبہ اپنے رشتہ دار کی شادی میں تشریف لے جا رہی ہیں۔ انھیں خوب سجا دو۔ سردی کا موسم ہے، میرا وہ روئیں دار نیا کوٹ بھی انھیں پہنا دو۔ اسی طرح اس کے بچّوں کو بھی اچھی طرح سجا دو۔ اور سنو! باہر جو گاڑی کھڑی ہے اس میں دو گھوڑے جُتوا دو۔ اس کے رشتہ دار کی شادی کوئی روز روز تھوڑے ہی ہوتی ہے۔ ذرا ٹھاٹھ سے سوار ہو کر جائے گی۔ چنانچہ مالکن اور اس کی نوکرانی نے بکری اور اس کے میمنوں کو خوب سجایا اور گاڑی میں دو گھوڑے جُتوا کر بکری اور اس کے بچّوں کو بڑی شان سے گاڑی میں بٹھایا۔ اور لگام بدلو کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔ ”بھائی! کوچوان تو گھر پر ہے نہیں۔ ہمّت کر کے آپ خود ہی کوچوانی کیجیے۔ لیکن گاڑی ذرا دھیرے چلانا۔ ایسا نہ ہو کہ ہماری بکری صاحبہ یا اس کے بچّوں میں سے کسی کے چوٹ لگ جائے۔ اچھا الوداع بکری صاحبہ!“

”آپ بے فکر رہیے مالکن صاحبہ!“ کہتے ہوئے بدلو نے گھوڑوں کی لگام تھامی اور اپنی راہ لی۔ دو گھوڑوں کی گاڑی میں سجی ہوئی بکری یوں وِداع ہو رہی تھی جیسے کوئی دُلہن اپنے میکے سے وِداع ہوتی ہے۔ اور بدلو اس ٹھاٹھ سے گاڑی ہانک رہا تھا جیسے کوئی دُلہن کو لیے جا رہا ہو۔ یہ تماشہ دیکھ کر مالکن اور اس کی نوکرانی کے ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ گئے۔ جب تک گاڑی اُن کی نظروں سے اوجھل نہیں ہو گئی

اُن کی ہنسی نے رُکنے کا نام نہ لیا۔

تھوڑی دیر بعد زمیندار جب گھر پہنچا تو بیوی کو بہت خوش پایا۔ دراصل وہ سوچ رہی تھی کہ جب وہ میاں کو اس شخص کی بے وقوفی کا قصّہ سُنائے گی۔ تو وہ بے حد خوش ہوگا۔ قصّہ شروع کرنے سے پہلے مالکن نے جب نوکرانی کی طرف دیکھا تو اس کے ہونٹوں پر بھی وہی شرارت بھری مُسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ پھر کیا تھا۔ مالکن قہقہے لگا کر ہنسنے لگی۔ مارے ہنسی کے اس کا بُرا حال تھا۔ اس کی ہنسی جب ذرا دِھیمی پڑی تو زمیندار نے پُوچھا کہ آخر بات کیا ہے۔ مَیں بھی تو سُنوں۔

بیوی نے کہا۔" اجی پوچھو مت۔ آج تو کمال ہی ہو گیا۔ کتنا مزا آرہا تھا۔ تم نے تو دیکھا ہی نہیں کہ کیسے ایک عجیب و غریب بے وقوف یہاں آیا۔ اور گھٹنے ٹیک کر ہماری بکری کے سامنے بہت دیر تک ایسے جھکا رہا جیسے کوئی عقیدت مند اپنے رُوٹھے ہوئے پیر کو مناتا ہو۔ وہ بار بار اُسے جھک جھک کر سلام کر رہا تھا۔ پُوچھنے پر بولا کہ یہ بکری صاحبہ اس کی بیوی کی رشتے دار ہیں۔ اور وہ اسے اپنے لڑکے کی شادی میں شرکت کی دعوت دینے آیا ہے۔ کہتے کہتے بیوی تو ہنستی چلی جارہی تھی مگر زمیندار کو غصّہ آرہا تھا۔

"ہاں ہاں! مَیں سمجھ گیا۔ تم نے کیا کیا ہوگا۔" زمیندار نے کہا۔ تم نے بکری اور اس کے میمنوں کو اس عجیب آدمی کے حوالے کر دیا ہوگا۔" یہی کیا ہے نا؟"

"بالکل یہی تو کیا ہم نے۔ بلکہ اُسے اور زیادہ بے وقوف بنانے کے لیے بکری کو خوب سجایا۔ اُسے اپنا روئیں دار لال کوٹ بھی پہنا دیا۔ اسی طرح اس کے بچّوں کو بھی سجا کر دو گھوڑے کی بگھی میں بھیجا ہے۔ تم بھی ذرا دیکھتے تو مزا آجاتا۔ کس ٹھاٹھ سے اپنے رشتہ دار کے ساتھ جا رہی تھی بکری صاحبہ"۔ بیوی نے کہا۔

"بس بس! رہنے دو۔ اس کے رشتے دار کا کچھ اتہ پتہ بھی پُوچھ لیا تھا کیا؟

زمیندار نے پوچھا۔

"نہیں! یہ تو ہم نے کچھ نہیں پوچھا تھا"۔ بیوی نے جواب دیا۔

تو اِس کا مطلب یہ ہے کہ بے وقوف وہ نہیں تھا۔ بلکہ وہ تم سب کو بے وقوف بنا گیا ہے۔ زمیندار کو اپنی بیوی پر بہت غصّہ آ رہا تھا۔ کِدھر گیا ہے وہ۔ زمیندار نے جلدی سے پوچھا۔

بیوی نے اُنگلی سے اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔ اِدھر کو۔

زمیندار نے فوراً اپنا گھوڑا تیار کیا اور اس کا پیچھا کرنے لگا۔ بدلو کو پہلے ہی شُبہ تھا کہ اگر زمیندار کو پتہ چل گیا تو وہ ضرور پیچھا کرے گا۔ رفتہ رفتہ اسے ایسا محسوس ہونے لگا، جیسے کہ کوئی اس کا پیچھا کر رہا ہو۔ اس نے اپنے گھوڑوں کا رُخ ایک گھنے جنگل کی طرف موڑ دیا۔ گھوڑوں اور گاڑی کو جھاڑیوں کی اوٹ میں کھڑا کر کے خود جنگل سے باہر نکل آیا اور اپنی ٹوپی اُتار کر زمین پر اوندھی رکھ دی۔ اتنے میں زمیندار بھی اُدھر ہی آ نکلا۔ اس نے بدلو سے پوچھا۔ "او بھائی ٹوپی والے! ادھر تم نے کِسی کو دو گھوڑوں کی گاڑی میں جاتے ہوئے بھی دیکھا ہے"۔

"جی ہاں! دیکھا تو تھا حضور۔ اس گھوڑے گاڑی میں ایک بکری اور اس کے تین میمنے بھی سوار تھے۔ مگر اسے نِکلے تو کافی دیر ہو چُکی ہے"۔ بدلو نے جواب دیا۔

"کِس طرف کو گیا ہے وہ۔ مجھے اسی کو پکڑنا ہے"۔ زمیندار بولا۔

بدلو نے پوچھا۔ کیا آپ اس راستے کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ اگر نہیں جانتے تو اسے پکڑنا بہت مُشکل ہے۔ اس راستے میں کئی موڑ آتے ہیں۔ راستے سے راستہ نکلتا چلا جاتا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ آپ خود بھی بھٹک جائیں۔

"ارے بھائی! اگر یہ بات ہے تو تمہیں میری مدد کرو۔ اسے پکڑنا بہت ضروری ہے۔ لو میرا یہ گھوڑا لے جاؤ۔ زمیندار نے اس کی خوشامد کرتے ہوئے کہا۔"

"نہیں حضور میں جا نہیں سکوں گا۔ میری اس ٹوپی کے نیچے ایک شکرہ بیٹھا ہے۔ میں اسی کی نگرانی کر رہا ہوں۔" بدلو نے کہا۔

"انکار نہ کرو میرے اچھے بھائی۔ یہ گھوڑا لو اور فوراً چلے جاؤ۔ تمہارے شکرے کی نگرانی میں کروں گا۔" زمیندار نے کہا۔

"تو خیال رکھنا کہیں اُڑ نہ جائے۔ بہت قیمتی شکرہ ہے۔ کہیں کھو گیا تو میرا مالک مجھے کچّا چبا جائے گا۔ اِسی لیے تو جا نہیں رہا ہوں۔" بدلو نے زور دیتے ہوئے کہا۔

"کیا دام ہوں گے اس کے۔" زمیندار نے پُوچھا۔

"یہی کوئی پانچ سو روپے سے کم کیا ہوں گے۔" بدلو نے جواب دیا۔

"تو پرواہ مت کرو۔ اگر یہ کھو گیا تو اتنی رقم میں ادا کروں گا۔" زمیندار نے تسلّی دیتے ہوئے کہا۔

بدلو نے بات بنتے ہوئے دیکھ کر کہا۔ "نہیں سرکار زبانی جمع خرچ سے کام نہیں چلے گا۔ مجھے اپنے مالک سے بہت ڈر لگتا ہے۔"

زمیندار نے رقم بدلو کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اگر میری زبان پر اعتماد نہیں۔ تو یہ پانچ سو روپے ضمانت رکھ لو۔"

بدلو نے روپے لے کر جیب میں ڈالے اور اسی کے گھوڑے پر سوار ہو کر چلتا بنا۔ اور زمیندار صاحب خالی ٹوپی کی پہرے داری کرتے رہے۔ انتظار کرتے کرتے گھنٹوں بیت گئے۔ لیکن بدلو واپس نہ لوٹا۔ انتظار کی گھڑیاں لمبی ہوتے دیکھ کر زمیندار اُکتا گیا۔ سوچا کر ٹوپی کے نیچے تو دیکھیں کہ کچھ ہے بھی یا نہیں۔ اگر نہیں ہے تو بے کار انتظار سے کیا فائدہ۔ ٹوپی کو دھیرے دھیرے اُٹھانا شروع کیا۔ دیکھا تو کچھ بھی نہ تھا۔ "بدمعاش کہیں کا۔ لگتا ہے یہ وہی شخص تھا۔ جس نے میری بیوی کو بے وقوف بنایا تھا۔ زمیندار نے نفرت سے زمین پر تھُوکا اور گھر کی طرف چل دیا۔

اِدھر بدلو بھی تین خوب صورت گھوڑے اور ایک بگھی اور تین ننھے ننھے بچوں والی صحت مند بکری لے کر گھر پہنچ چکا تھا۔ جاتے ہی اپنی ماں سے بولا۔ "اماں اب میں ہمیشہ تمھارے پاس رہوں گا۔ میں تو سمجھتا تھا کہ ایک تمھیں سیدھی ہو۔ لیکن دیکھا تو دنیا میں تم سے بھی زیادہ سیدھے لوگ موجود ہیں۔

مسرّت کے آنسو

غلام حیدر شاہ نہ صرف ایک دولت مند آدمی تھے بلکہ وہ ایک بلند پایہ عالم، فاضل، سخی اور رحم دل انسان بھی تھے۔ لوگ انھیں عموماً شاہ جی کہہ کر پکارتے تھے۔ شاہ جی کے تین بیٹے تھے۔ بڑے کا نام گلزار، منجھلے کا اشفاق اور چھوٹے کا فرزند تھا۔ دونوں بڑے بیٹے فطری طور پر کھلنڈرے اور رنگین مزاج تھے۔ جب کہ چھوٹا بیٹا فرزند عادات و اطوار کے لحاظ سے اپنے بڑے بھائیوں سے زیادہ علم دوست اور رحم دل تھا۔

شاہ جی اپنے تینوں بیٹوں سے برابر محبّت کرتے تھے۔ اور ان سب کی تعلیم و تربیت کا باقاعدہ خیال رکھتے تھے۔ ان کی دلی خواہش تھی کہ بیٹے ان کے نقشِ قدم پر چل کر علم دوست نیک اور خدا ترس انسان بنیں۔ اسی لیے وہ اکثر انھیں اپنے پاس بٹھا کر نصیحت کیا کرتے کہ " میرے بیٹو! دُنیا میں دُکھ اور سُکھ انسان خود ہی پیدا کرتا ہے۔ دراصل آدمی اپنے ساتھ کچھ بھی لے کر نہیں آتا۔ وہ جو کچھ بھی پاتا ہے، خُدا کی مہربانی سے پاتا ہے۔ اپنی مُحبّت اور ہمدردی، محنت اور کوشش کی بدولت پاتا ہے۔ اگر کچھ کھو بھی دیتا ہے، تو غم نہیں کرنا چاہیے۔ بلکہ یہ سمجھنا چاہیے کہ دینے والے نے اپنی امانت واپس لے لی ہے۔ آج جو کچھ بھی کسی کے پاس ہے، کل وہ کسی اور کا تھا۔ اور پرسوں وہ کسی اور کا ہوگا۔ اس ناپائدار دُنیا میں دولت کو پاکر آدمی جب مغرور اور بے فکر ہو جاتا ہے تو یہی غرور اور بے فکرا بن

اس کے دُکھ کا باعث بن جاتا ہے۔ آدمی وہی اچھا ہوتا ہے جو دوسروں کے ساتھ مِل جُل کر رہے۔ نہ ہیرے کی طرح کمیاب ہو اور نہ پتھر کی طرح در در کی ٹھوکریں کھاتے۔ کسی غریب کی روزی نہ چھینے۔ ضرورت مندوں کو ٹال کر مایوس نہ کرے۔ بلکہ حاجت مندوں کی حاجت روا کر کے دُکھی دِل سے دُعائیں لے۔"

شاہ جی میں یہ اور بھی خوبی تھی کہ وہ محض نصیحتیں ہی نہیں کرتے تھے بلکہ یہ دیکھنے کے لیے کہ کیا بیٹے ان کی نصیحتوں پر عمل بھی کرتے ہیں یا نہیں، کبھی کبھی ان کا امتحان بھی لے لیا کرتے تھے۔ اکثر بچّے تو امتحان کے نام ہی سے گھبرانے لگتے ہیں۔ گھبرایئے نہیں۔ پڑھائی لکھائی کا امتحان تو اسکول میں ہوتا ہے۔ شاہ جی اپنے بیٹوں کی رحم دِلی، نیکی، اور فیاضی کی آزمائش کرتے تھے۔ اسی مقصد کے لیے ایک دن شاہ جی نے اپنے تینوں بیٹوں کو بُلایا اور سب کو برابر برابر رقم دے کر کہا۔ "پیارے بیٹو! کل تمھارا اسکول تو بند رہے گا۔ تم ایک کام کرنا۔ ضرورت پڑے تو اس رقم میں اپنے جیب خرچ سے کچھ پیسے مِلا کر اپنی اپنی پسند کی کوئی بھی عُمدہ چیز میرے لیے خرید کر لانا۔ جس کا تحفہ بہترین ہوگا، نہ صرف باقی دونوں کی لائی ہوئی چیزیں اسی کو انعام میں دے دی جائیں گی بلکہ اپنی طرف سے بھی اسے کچھ انعام دُوں گا۔ کل رات کے کھانے کے بعد تم سب کو اپنی اپنی پسند کی خریدی ہوئی چیزیں مجھے دِکھانی ہوں گی۔"

یہ سُن کر تینوں بیٹے بہت خوش ہوئے اور انعام پانے کی خوشی میں وہ ایک دوسرے سے بڑھیا چیز لانے کے بارے میں سوچنے لگے۔ وہ دِل ہی دِل میں سوچ کر خوش ہو رہے تھے۔ کوئی کسی کو کچھ نہیں بتاتا تھا کہ کل وہ کیا چیز لانے والا ہے۔ اگلے دن اسکول سے چھٹّی تو تھی ہی۔ تینوں الگ الگ سمتوں میں خوب سے خوب تر چیز کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ شام ہوتے ہی دونوں بڑے بیٹے

تو اپنی اپنی پسند کی چیزیں لے کر گھر لوٹ آئے لیکن چھوٹا بیٹا ابھی نہیں لوٹا تھا۔ رات کے کھانے کا وقت ہو رہا تھا۔ پھر بھی شاہ جی نے انھیں کچھ دیر اور فرزند علی کا انتظار کرنے کے لیے کہا۔ کچھ ہی دیر میں فرزند بھی آ پہنچا۔ سب نے مل کر کھانا کھایا اور اس کے بعد انعامی مقابلہ شروع ہو گیا۔

تینوں بیٹے اپنا اپنا تحفہ لے کر ایک طرف بیٹھ گئے۔ گلزار اور اشفاق کے چہرے خاصے پُر اُمید دِکھائی دیتے تھے۔ لیکن فرزند کے چہرے پر کسی قدر سنجیدگی کے آثار نمایاں تھے۔ شاہ جی مُسکراتے ہوئے اپنے بڑے بیٹے سے بولے۔ ”کہو، بیٹا گلزار! میرے لیے کیا لائے ہو؟“

گلزار تو پہلے ہی اس حکم کے انتظار میں بیٹھا تھا۔ فوراً اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک مخملی ڈبیا نکال کر سامنے رکھ دی۔ جب اس ڈِبیا کو کھولا گیا تو ایک خوب صورت انگوٹھی کو دیکھ کر سب کی آنکھیں کُھلی کی کُھلی رہ گئیں۔ کتنی دِل کش انگوٹھی تھی۔ لیکن اس انگوٹھی کو دیکھ کر شاہ جی کو کوئی خاص خوشی نہ ہوئی۔ پھر بھی بظاہر مُسکراتے ہوئے بولے۔ ”واہ کتنی خوب صورت اور قیمتی انگوٹھی ہے۔ لگتا ہے گلزار میاں کسی بادشاہ کے خزانے سے اُڑا لائے ہیں۔ واقعی بہت خوب ہے یہ۔“

گلزار کچھ کہنا چاہتا تھا کہ شاہ جی اپنے منجھلے بیٹے اشفاق سے مُخاطب ہوئے۔ ”اشفاق میاں! لائیے، آپ میرے لیے کیا پسند کر کے لائے ہیں۔ ہم بھی تو دیکھیں۔“

اشفاق نے بڑے ادب سے تیز دھار والی ایک چمک دار تلوار پیش کی۔ اس کا دستہ بہت ہی خوب صورت اور مضبوط تھا۔ اس بار بھی شاہ جی کو مایوسی ہی ہوئی۔ لیکن اپنی مایوسی کو چُھپاتے ہوئے بولے۔ ”واہ! اشفاق میاں، کیا خوب

پسند ہے تمہاری۔ بہادر ہمیشہ ایسی ہی چیزیں پسند کرتے ہیں۔ لگتا ہے تم انعام پاؤ گے۔"

اشفاق میاں تھے کہ اپنی تعریف سُن کر خوشی سے پھولے نہ سمائے۔ ان کے بعد چھوٹے میاں کی باری تھی۔ شاہ جی اس سے مُخاطب ہوئے۔ "فرزندِ ارجمند! آپ نے میرے لیے کون سی چیز پسند کی ہے۔

فرزند نے پہلے تو جُھکی جُھکی نظروں سے اپنے دونوں بھائیوں کی طرف دیکھا۔ پھر جھجکتے جھجکتے کاغذ کی ڈھکی ہوئی چینی مٹی کی ایک چھوٹی سی پیالی نکالی۔ اس کی تہہ میں اوس نُما پانی کے چند قطرے چمک رہے تھے۔ جنھیں دیکھ کر شاہ جی کے دل کو تسکین سی محسوس ہوئی۔ حیرت اور مسرت کے مِلے جُلے جذبات کے ساتھ شاہ جی نے پُوچھا۔ "میاں فرزند! ان دونوں کے تحفوں اور ان کی افادیت کو سمجھنے میں تو مجھے کسی دُشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ البتہ تمہارے تحفے نے مجھے اُلجھن میں ڈال دیا ہے۔ ذرا بتاؤ تو۔ یہ کیا چیز ہے۔"

دونوں بڑے بھائی دل ہی دل میں خوش ہو رہے تھے کہ ان کی قیمتی چیزوں کے مقابلے میں فرزند میاں کے لائے ہوئے پانی کے چند قطروں کی بھلا کیا وقعت ہے۔ انعام یقیناً انھیں میں سے کسی ایک کو ملے گا۔

فرزند کے معصوم چہرے پر سنجیدگی کے آثار اور بھی گہرے ہو گئے۔ وہ قدرے اطمینان سے بولا۔

"ابّا حضور! بظاہر پانی کی یہ چند بوندیں دُکھی انسانیت کے دل کی دُعاؤں کا نچوڑ ہے۔ جب یہ آنکھوں کے راستے ٹپکتی ہیں تو لوگ انھیں مسرت کے آنسو کہتے ہیں۔

شاہ جی نے اور بھی تعجب سے پوچھا۔

"یہ تحفہ تمہیں کہاں سے ملا"

جیسے کسی اچانک حادثے نے جھنجوڑ دیا ہو۔ فرزند علی نے ایک گہری سانس لی اور پھر انتہائی سنجیدگی سے بولا۔

"ابا جان! آپ کے حکم کی تعمیل کے لیے میں بھی کسی قیمتی تحفے کی تلاش میں نکلا تھا کہ راستے میں چیتھڑوں سے تن ڈھانپے، بھوک سے نڈھال ایک غریب عورت مل گئی۔ جب میں اس کے قریب پہنچا تو وہ اپنا سوکھا ہوا ہاتھ میرے سامنے پھیلا کر لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔ بیٹا اللہ کے نام پر کچھ دیتے جاؤ۔ میرا بچہ کئی دنوں سے بھوکا ہے۔ آج بھی اگر اسے کھانے کو کچھ نہ مل سکا تو شاید.......... یہ کہتے کہتے اس کا گلا رندھ گیا۔ اور وہ زارو قطار رونے لگی۔ مجھے اس کی حالت پر رحم آگیا۔ میں اسی وقت بھاگا بھاگا گیا اور پاس کی ایک دوکان سے شیشے کے گلاس میں دودھ لے آیا۔ ڈبل روٹی اور بسکٹوں کے پیکٹوں کے علاوہ کچھ اور پھل بھی خریدے اور اس غریب عورت کے ساتھ اس کی جھونپڑی میں پہنچانے چلا گیا۔ دیکھا تو وہاں ایک دبلا پتلا لڑکا آنکھیں بند کیے ٹاٹ پر پڑا تھا۔ غریب عورت نے دودھ کا گلاس میرے ہاتھ سے لے لیا۔ پھر لپک کر اس نیم جان لڑکے کے پاس پہنچی۔ اور تھوڑا تھوڑا کر کے دودھ اس کے حلق میں ٹپکانے لگی۔

میں وہیں بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد لڑکے کے کمزور جسم میں کچھ جان آئی تو وہ خود ہی اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ بچے کو بیٹھے دیکھ کر ماں کا دل باغ باغ ہو گیا۔ بچے نے ڈبل روٹی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ماں نے ڈبل روٹی کا پیکٹ

کھول کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ جب وہ کافی ڈبل روٹی کھا چکا تو اُس نے ماں کو بھی کھانے کے لیے کہا۔ پھر ماں بیٹا دونوں ڈبل روٹی کھاتے رہے۔ کھانے میں وہ اس قدر محو ہوئے کہ انھیں میری موجودگی کا بھی احساس نہ رہا۔ کچھ دیر بعد جب اُس عورت کو میرا خیال آیا تو لگی مجھے دُعائیں دینے۔ ایک نظر وہ اپنے بیٹے پر ڈالتی تھی تو دوسری نظر مجھ پر ڈال کر پھر دُعائیں دینے لگتی تھی۔ رفتہ رفتہ اس کے دل کی گہرائیوں سے نکلنے والی دُعائیں آنسو بن کر اُس کی آنکھوں سے ٹپکنے لگیں۔ یہ یقیناً مسرت کے آنسو تھے۔ جب آنسو اس کی آنکھوں سے ٹپک رہے تھے، تو میں اُنھیں اِس پیالی میں اِکٹھا کرتا جاتا تھا۔ اور اس سے باتیں بھی کرتا جاتا تھا۔

باتوں باتوں میں جب میں نے اس کی دھارس بندھائی تو اس کے آنسو بھی رفتہ رفتہ تھم گئے۔ ہمدردی کے طور پر میں نے اس لڑکے کے باپ کے متعلق پُوچھا تو پتہ چلا کہ لڑکے کا باپ اللّٰہ کو پیارا ہو چکا ہے۔ کمانے والا کوئی نہیں ہے۔ ایک ایک کر کے گھر کا سارا سامان بِک چُکا ہے۔ لڑکے کو پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ لیکن وقت پر فیس ادا نہ کر سکنے کی وجہ سے اس کا نام اسکول سے کاٹ دیا گیا۔ یہ سُن کر مجھے بہت افسوس ہوا۔ باقی رقم جو میرے پاس بچی تھی، وہ بھی اسے دے دی تاکہ وہ لڑکا اپنی تعلیم جاری کر سکے۔ اسی سلسلے میں آئندہ کے لیے بھی میں نے اپنے جیب خرچ سے اس لڑکے کی کبھی کبھی مدد کرنے کا وعدہ کر لیا ہے۔ ابّا جان! میری جیب خالی ہو چکی تھی۔ آپ کے لیے کوئی تحفہ خریدنے سے قاصر تھا۔ چنانچہ ایک دُکھیاری کے آنسوؤں کے چند قطرے

آپ کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے لیتا آیا ہوں"۔ یہ کہتے کہتے فرزند نے سر جُھکا لیا۔

بیٹے کی باتیں سُنتے ہوئے شاہ جی کا چہرہ تو خوشی سے چمک رہا تھا لیکن آنکھیں آنسوؤں سے تر تھیں۔ وہ بڑے غور سے اپنے بیٹے کے چہرے کے اُتار چڑھاؤ کو دیکھتے جا رہے تھے۔ بیٹا جب بات ختم کر چُکا تو شاہ جی اُسے سینے سے لگاتے ہوئے بولے۔ "بیٹا! مجھے تم سے یہی امید تھی"۔

اس کے بعد شاہ جی نے اپنے دوسرے بیٹوں کو بھی مُخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "میرے بیٹو! سُن لیا تمھارے بھائی فرزند نے کس طرح ایک غریب محتاج کو موت کے مُنہ میں جانے سے بچا لیا۔ یہی انسانیت ہے۔ آدمی اگرچہ کسی مُردے میں جان نہیں ڈال سکتا، پھر بھی کسی بھوکے پیاسے کی ہر وقت مدد کر کے اسے بے موت مرنے سے بچانے کی کوشش ضرور کر سکتا ہے۔ قربانی کے جانوروں کے خون سے گُناہوں کا میل نہیں دُھل سکتا۔ اس میل کو رحم کے پانی سے ہی دھویا جا سکتا۔ اس لیے رحم دل بنو اور کمزوروں پر رحم کرو۔ فرزند نے رحم کھا کر ایک غریب لڑکے کی جان بچائی اس لیے وہ انعام کا مستحق ہے۔ یہ کہتے ہوئے شاہ جی نے فرزند کی پیٹھ پر تھپکی دی۔ پھر تلوار اور انگوٹھی بھی اسی کو سونپتے ہوئے بولے۔ "میری طرف سے تمھیں یہ انعام دیا جاتا ہے کہ اس غریب لڑکے کی آئندہ مدد کا وعدہ جو تم نے کہا ہے، اسے مَیں پورا کروں گا۔ تم اس کی خبر لیتے رہنا اور جب بھی ضرورت پڑے اس کارِ خیر کے لیے پیسے مجھ سے لیا کرنا۔

حرکت میں برکت

ایک جنگل تھا۔ اس جنگل میں بے شمار جانور رہتے تھے۔ شیر چونکہ تمام جانوروں میں سب سے زیادہ پھرتیلا، چاق و چوبند اور بہادر ہوتا ہے اس لیے وہاں بھی وہ جنگل کا بادشاہ مانا جاتا تھا۔ وہ اپنا شکار خود کرتا اور خوب پیٹ بھر کر کھاتا تھا۔

اسی جنگل میں ایک گیدڑ بھی رہتا تھا۔ اس کا بھٹ شیر کی کچھار کے قریب ہی تھا۔ پاس پاس رہنے کی وجہ سے دونوں ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے تھے۔ پھر بھی گیدڑ شیر کی صحبت کا اثر قبول نہ کر سکا۔ شیر کے مقابلے میں گیدڑ انتہائی درجے کا کاہل، نکما اور کام چور واقع ہوا تھا۔ اپنی روزی حاصل کرنے کے لیے ہاتھ پَیر ہلانا بھی اس کے لیے محال تھا۔ اپنی اسی کاہلی اور سستی کی وجہ سے اسے اکثر بھوکا پیاسا ہی رہنا پڑتا تھا۔

حرکت ہی میں برکت ہے۔ جو ہاتھ پَیر ہلانا نہیں چاہتا اسے پیٹ بھر کھانا ملنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ گیدڑ بھوکا پیاسا رہنے کی وجہ سے دن بدن ناتواں ہونے لگا، تو ایک دن وہ اپنے پڑوسی شیر کے پاس گیا۔ اور افسردہ سا ایک طرف بیٹھ گیا۔ گیدڑ کو اداس دیکھ کر شیر نے پوچھا۔ "کہو! اس قدر اداس کیوں ہو۔ کس نے ستایا ہے تمہیں؟"

گیدڑ نے شکایت کے لہجے میں جواب دیا۔ "میرے آقا! میرے سمیت جنگل

کے تمام جانور آپ کو اپنا بادشاہ تسلیم کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے ہم سب آپ کی رعایا ہیں۔ لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہمارا بادشاہ اپنی رعایا کی خبر گیری کے سلسلے میں لاپرواہی سے کام لیتا ہے۔ اپنی رعایا کی اسے کوئی پرواہ نہیں۔ رعایا جیے یا مرے، اس کی بلا سے۔ وہ خود خوب سیر ہو کر کھاتا ہے اور گل چھرے اُڑاتا ہے۔ میرے مالک! اپنی رعایا کا کچھ تو خیال کیجیے۔"

گیدڑ کا گلہ سُن کر شیر نے کہا۔ "مَیں تو سمجھتا تھا کہ خُدائے برتر نے میری طرح سب کو عقل کے ساتھ ساتھ ہاتھ اور پاؤں بھی عطا کیے ہیں جن سے کام لے کر ہر کوئی بخوبی اپنی خوراک خود تلاش کر سکتا ہے۔ پھر بھی مَیں ہر مُمکن کوشش کرتا ہوں کہ کسی کو مجھ سے شکایت نہ ہو۔ اس کے باوجود اگر کسی اپاہج کو اپنی روزی تلاش کرنے میں دِقّت ہو تو اسے میرے پاس آ کر بتانا چاہیے۔ تاکہ مَیں محتاج کے کھانے پینے کا انتظام کر سکوں۔ مَیں جنگل کا بادشاہ ضرور ہوں لیکن ہر ایک جانور کی حاجت روائی کا میرے پاس کوئی ذریعہ نہیں۔"

تیر نشانے پر بیٹھتے دیکھ کر گیدڑ نے شیر کو اور بھی جوش دِلانے کے لیے کہا۔ "اے جنگل کے بادشاہ! گُستاخی معاف ہو تو عرض کروں کہ جسے اپنے پڑوسیوں کی حالت کا علم نہ ہو، وہ کسی اور کی خبر گیری کیا کرے گا۔ کسی نے سچ کہا ہے، جس کے پیر نہ پھٹے بوائی، وہ کیا جانے پیڑ پرائی۔"

غُصّے میں آ کر شیر ذرا ترش لہجے میں بولا۔ "آج تم کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو۔ جب بھی تم کسی مُصیبت میں مُبتلا ہوئے، مَیں فوراً تمہاری مدد کو پہنچا ہوں۔ پھر اس بات سے بھی بخوبی واقف ہو کہ میرے پڑوس میں رہنے کی وجہ سے تم دوسرے جانوروں کی زیادتیوں سے محفوظ رہتے ہو۔ پورے جنگل کا تم نے ٹھیکہ لے رکھا ہے کیا؟ تمہیں کوئی تکلیف ہو تو بتاؤ۔"

شیر کے تیور بدلتے دیکھ کر گیدڑ نے نرمی سے کام نکالنا چاہا۔ اور مُسکراتے ہوئے بولا۔ "اس میں شک نہیں کہ مجھے آپ کا پڑوسی ہونے کا فخر حاصل ہے۔ لیکن کیا یہ ستم ظریفی نہیں کہ بدقسمت خاک سار ہی آپ کی بے اعتنائی کا شکار بھی ہے۔"

یہ سُن کر شیر کو بہت افسوس ہوا۔ اس نے کہا۔ "تم نے تو مجھے اُلجھن میں ڈال دیا ہے۔ تمہاری پہیلیاں میری سمجھ سے باہر ہیں۔ مَیں تمہاری ناگوار بات بھی گوارا کرنے کو تیار ہوں لیکن ذرا صاف صاف کہو کہ تم پر کون سی مُصیبت آن پڑی ہے جس سے مَیں تمہیں چھٹکارا دِلاؤں۔ کچھ کہو تو سہی۔"

رونی سی صورت بنا کر گیدڑ نے کہا۔ "کیا بتاؤں سچّی بات تو یہ ہے کہ آپ کی غفلت سے زیادہ مَیں اپنی فطرت کا شکار ہوں۔ پیدا کرنے والے نے یہ بات میری فطرت میں داخل کر دی ہے کہ خود کو زندہ رکھنے کے لیے بھی مَیں کسی دوسرے کی جان نہیں لے سکتا۔ کیوں کہ فطرتاً امن پسند اور رحم دِل واقع ہوا ہوں۔ اس لیے کسی دوسرے کے خون سے ہولی کھیلنے سے پہلے خود مجھ پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔ پھر اگر کوئی ذرا سا بھی دھکا دے تو بیسیوں بار مُڑ مُڑ کر پیچھے دیکھتا رہتا ہوں کہ کہیں وہ میرا پیچھا تو نہیں کر رہا ہے۔ اسی فطری کمزوری کی وجہ سے اکثر بھوکا پیاسا پڑا رہتا ہوں۔ مہربانی کر کے میرے کھانے پینے کا کوئی مُستقل بندوبست کر دیجیے۔"

شیر کو گیدڑ کی کاہلی پر رحم آ گیا۔ اور کہنے لگا۔ "یہ بات تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتائی۔ افسوس ہے کہ تم ہاتھ پَیر تو ہلانا نہیں چاہتے اور اپنی ذاتی کمزوری پر پردہ ڈالنے کے لیے فطرت کو بدنام کرتے ہو۔ پھر بھی تمہاری خوراک کا مسئلہ مَیں حل کیے دیتا ہوں۔ جانتے ہو کہ اپنے کھانے کے لیے مَیں جو شکار کرتا ہوں، وہ میری خوراک سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ میرا

خیال ہے کہ بچا ہوا شکار تمہارا پیٹ آسانی سے بھر سکتا ہے۔ آج سے تم ایسا کرنا کہ جب میں شکار کو نکلوں تو تم بھی میرے ساتھ ہو لیا کرو۔ شکار میں کروں گا۔ جب میں کھا چکوں، تو تم بھی خوب پیٹ بھر کر کھا لیا کرنا۔"

گیدڑ نے دِل میں سوچا کہ لگتا ہے شکار کے لیے اب یہ مجھے بھی اپنے ساتھ ساتھ بھگائے گا۔ اور پھر مجھے بھی جنگل میں مارا مارا پھرنا پڑے گا۔ ایسا تو میں اکیلے بھی کر سکتا ہوں۔ اس کا احسان لینے کی کیا ضرورت ہے۔ مزا تو تب ہے کہ بغیر ہاتھ پیر ہلائے ہی خوراک ملتی رہے۔ ہینگ لگے نہ پھٹکری اور رنگ چوکھا آجائے۔ پھر ایک نیا بہانہ تراش کر بولا۔

"جنابِ من! اپنے ساتھ چلنے کے لیے مجھے مجبور نہ کیجیے اس سے مجھے آپ کی بدنامی کا ڈر ہے۔ دوسرے جانور کہیں یہ نہ سمجھنے لگیں کہ گیدڑ کے مارے ہوئے شکار سے شیر اپنا پیٹ بھرتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ آپ کے ساتھ دیکھ کر وہ مجھے ظالم اور خون خوار سمجھیں گے اور خواہ مخواہ میری جان کے دشمن ہو جائیں گے۔ آپ براہِ مہربانی بچے ہوئے شکار کو اپنے ساتھ لے آیا کیجیے۔ میرا گھر تو آپ کے راستے ہی میں پڑتا ہے۔ شکار وہاں چھوڑ کر آپ اپنی کچھار میں آرام فرمایا کیجیے۔"

گیدڑ کو خوش کرنے کے لیے شیر نے اس کی بات مان لی۔ چنانچہ اس دِن سے شیر کا یہ معمول ہو گیا کہ ہر روز جب وہ شکار کرتا تو پہلے اپنی پسند کے حصے کے گوشت سے خود اپنا پیٹ بھرتا اور باقی ماندہ کو منہ میں دبائے چلا آتا۔ اور اسے گیدڑ کے آگے ڈال کر خود اپنی کچھار میں آرام کرنے لگتا۔

اس طرح سے کاہل گیدڑ نے مکاری سے بغیر ہاتھ پیر ہلائے اپنے

کھانے پینے کی ترکیب نکال لی۔ دِن گزرتے رہے اور محنت سے جی چُرانے والا گیدڑ شیر کا جھوٹا شکار کھا کھا کر پلتا رہا۔ اب وہ اپنے بھٹ سے بھی بہت کم باہر آتا تھا۔ وہیں پڑے پڑے دِن بھر کروٹیں بدلتا رہتا۔ کھانے کو مُفت میں مِل جاتا تھا۔ ہاتھ پیر ہلانے کی رہی سہی عادت بھی جاتی رہی۔ اور وہ روز بروز موٹا تازہ ہوتا گیا۔ کبھی یہ بھی نہ سوچا کہ اس ذِلّت کی زندگی سے عزّت کی موت کہیں زیادہ اچھی ہے۔

کِسی کے بھی دِن ہمیشہ ایک جیسے نہیں رہتے۔ ایک دِن اچانک شیر کی طبیعت خراب ہو گئی۔ اور وہ شکار کے لیے نہ جا سکا۔ گیدڑ کو بھوک لگ رہی تھی۔ اندھیرا پھیلتا جا رہا تھا۔ لیکن وہ اپنے بھٹ سے باہر نہ نکلا۔ شیر کا انتظار کرتا رہا۔ دوسرے دِن بھی شیر کی طبیعت نہ سنبھل سکی۔ گیدڑ پھر بھی اپنے بھٹ سے باہر نہ نکلا۔ بھوک سے نڈھال گیدڑ وہیں پڑا رہا۔ اِتنا بھی نہ ہو سکا کہ چار قدم پڑوس میں چل کر اپنے محسن کے بارے میں معلوم کرے کہ اس بے چارے پر کیا بیت رہی ہے۔ کہیں کسی حادثے کا شکار تو نہیں ہو گیا۔

طبیعت کی مُسلسل خرابی کی وجہ سے شیر دراصل کچھار سے زیادہ دُور شکار کو نہیں جا سکتا تھا۔ آس پاس ہی سے ہلکا پھلکا شکار کر کے اپنا پیٹ بھر لیتا تھا۔ ادھر مُفت کا مال اُڑانے والے گیدڑ کی حالت دِن بدن نازک ہوتی جا رہی تھی۔ ہِمّت کا دھنی شیر تو بیماری کی حالت میں بھی ہِمّت کر کے اپنے کھانے کا انتظام کرتا رہا۔ لیکن کاہل گیدڑ نے تندرست ہوتے ہوئے بھی آخری دم تک ہِمّت سے کام نہ لیا اور بھوک پیاس سے نڈھال ہو کر ایک دن دُنیا سے

چل بسا۔

شیر کی طبیعت سنبھلنی شروع ہو گئی تھی۔ دوسرے ہی دن جب وہ اپنا جھوٹا شکار لے کر گیدڑ کے بھٹ پر پہنچا تو گیدڑ کا انجام دیکھ کر بولا۔ "اے کاہل گیدڑ! افسوس ہے تیری موت پر۔ کاش! ہاتھ پیر سلامت ہوتے ہوئے کوئی اس گیدڑ کی طرح ذِلّت کی موت نہ مرے۔ سچ ہے کہ حرکت ہی میں برکت ہے۔"

انسان دوستی

ایک بادشاہ ہمیشہ اپنے ملک کی حدوں کو بڑھانے اور دوسروں کے علاقے ہڑپ کرنے کی فکر میں رہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ پاس پڑوس کے بادشاہوں کے ملک فتح کرکے خود شہنشاہ بن جائے۔ مگر اسے اپنی رعایا کے دُکھ درد کی کوئی پرواہ نہ تھی۔ دوسروں پر حملہ کرنے کے لیے وہ ہمیشہ کسی مناسب موقعے کی تاک میں رہتا تھا۔

ایک دن اسے پتہ چلا کہ اس کے ایک پڑوسی بادشاہ کا حال ہی میں انتقال ہوگیا ہے۔ اور وہاں کی حکومت کا کام کاج اس کا ایک کم سن بیٹا چلا رہا ہے۔ وہ سوچنے لگا کہ ہوسکتا ہے اس ناتجربہ کار بادشاہ کی فوجیں اس کے ساتھ وفاداری کا ثبوت نہ دیں۔ اور وہ علاقہ آسانی سے اس کے ہاتھ لگ جائے۔ یہی سوچ کر اس نے اپنے پڑوسی مُلک پر اچانک حملہ کر دیا۔ اور اس کے علاقے پر قبضہ کر لینے کے بعد شکست خوردہ بادشاہ کو اپنے دربار میں حاضر ہونے کا حُکم دیا۔

ہارا ہوا کم سن بادشاہ جب فاتح بادشاہ کے دربار میں حاضر ہونے کے لیے تیاری کر رہا تھا، تو اس کے وزیروں اور درباریوں نے سمجھانا شروع کیا کہ اگر کچھ ایسا موقع پیش آئے تو یُوں کیجیے گا۔ اور اگر وہ اس طرح کا سوال کرے تو

آپ ایسے جواب دیجیے گا۔ کم سن بادشاہ کی ماں نے جب دیکھا کہ نصیحتوں کی بھر مار سے اس کا بیٹا کچھ پریشانی سی محسوس کرنے لگا ہے تو وہ پیار سے بولی۔ "بیٹا! یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ وقت آنے پر کچھ بھی یاد نہیں رہتا۔ مناسب یہی ہے کہ خُدا کا نام لے کر روانہ ہو جاؤ۔ اور کیسا بھی وقت کیوں نہ آئے ہمّت اور مستقل مزاجی کا دامن مضبوطی سے تھامے رکھنا۔ اور پھر تم سے جو بھی سوال پُوچھا جائے اپنی عقل اور سمجھ کے مُطابق جو جی میں آئے، جواب دینا۔"

اپنی ماں کی نصیحت کے مطابق لڑکا خدا کا نام لے کر چل دیا۔ جیسے ہی وہ دربار میں پہنچا، بادشاہ نے اسے کچھ بھی سوچنے کا موقع نہ دیا۔ اور اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر، بڑے رعب سے بولا۔ "بتا! اب تیرے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟"

لڑکا تھوڑی دیر خاموش رہا۔ پھر بڑی ہمّت سے بولا۔ "اے بُزرگ بادشاہ! سلوک اور برتاؤ کے لیے تو اپنے اپنے مُلک کے مخصوص رواج ہوتے ہیں۔ ہمارے مُلک میں تو اگر کسی کا ہاتھ پکڑ لیتے ہیں تو زندگی بھر اس کا ساتھ نبھاتے ہیں۔ آپ نے تو میرے دونوں ہاتھ پکڑ لیے ہیں۔ میرے خیال میں تو اس کا مطلب صاف ہے۔ پھر بھی اگر میرا خیال غلط ہو تو جو بھی مزاج مُبارک میں آئے اسی کے مطابق سلوک کیجیے۔"

لڑکے کی عقل مندی سے بادشاہ بہت متاثر ہوا۔ اور اس کا غرور چُور چُور ہو گیا۔ اس کا خیال تھا کہ لڑکا کچھ بے ہودہ سا جواب دے گا تو اسے قید میں ڈالنے کا خاطر خواہ جواز مل جائے گا۔ لیکن متوقع جواب نہ پا کر بادشاہ نے پھر پُوچھا۔ "مرنے سے پہلے تمھارے والد مرحوم نے تمھیں کیا

نصیحت کی تھی"۔

لڑکے نے بڑے ادب سے جواب دیا۔"جناب مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میرے والد مرحوم نے فرمایا تھا۔بیٹا! کسی گرے ہوئے انسان کو کبھی ٹھوکر مت مارنا۔کل تم بھی گر سکتے ہو۔اس وقت لوگ تمھیں بھی ٹھوکریں ماریں گے۔انسان ہو۔ انسان کی قدر کرو۔پرندوں کی طرح ہوا میں اُڑنے اور مچھلیوں کی طرح پانی میں تیرنے کی بجائے انسانوں کی طرح زمین پر رہنا سیکھو اور انسان دوستی کا حق ادا کرو۔

بادشاہ لڑکے کی باتوں سے بہت خوش ہوا۔اور اس نے نہ صرف اس کی جان بخش دی بلکہ اس کا جیتا ہوا ملک بھی اسے واپس دے دیا۔لیکن یہ اثر دیرپا ثابت نہ ہو سکا۔کچھ ہی عرصے بعد اسی بادشاہ نے کسی اور ملک پر چڑھائی کر دی۔ مخالف بادشاہ نے اس کے مقابلے کے لیے نہ تو کوئی فوج بھیجی اور نہ اپنی حفاظت کا کوئی خاص انتظام کیا۔یہ دیکھ کر حملہ آور فوجوں کے حوصلے اور بھی بلند ہو گئے۔ ان کا خیال تھا کہ حریف کو شاید حملے کا علم نہیں ہے۔ہو سکتا ہے وہ کہیں پڑا غفلت کی نیند سو رہا ہو۔یہی وجہ ہے کہ انھیں کوئی پوچھنے والا نہیں کہ تم کون ہو اور اس طرح سے ہمارے علاقے میں کیوں گھسے چلے آ رہے ہو بادشاہ اپنے لاؤ لشکر لیے بے دھڑک بڑھتا چلا گیا۔یہاں تک کہ وہ اپنے حریف کے محل تک پہنچ گیا۔

محل پر پہنچ کر دیکھا کہ وہاں بھی کوئی پہرہ یا چوکی نہیں ہے۔وہ حیران تھا کہ آخر معاملہ کیا ہے۔اس کی فوجوں نے محل کو گھیرے میں لے لیا۔حملہ آور بادشاہ اور بھی رعب میں آ کر مونچھوں پر تاؤ دینے لگا۔اتنے میں اپنے دو ایک سرداروں کے ساتھ مغلوب ملک کا بادشاہ نہتے ہی محل سے باہر آیا اور آتے ہی ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا۔"حضور! یہ ملک آپ کا، یہ گھر آپ کا، جہاں جی چاہے رہیے۔جو جی میں آئے

کیجیے۔ اِتنی دُور سے آتے آتے آپ تھک گئے ہوں گے۔ بھُوک بھی لگ رہی ہوگی۔ آئیے! اندر تشریف لے آئیے۔ پہلے کھانا کھائیے۔ پھر ذرا آرام کر کے جو جی میں آئے، کیجیے۔"

اپنے کچھ جرنیلوں کے ساتھ حملہ آور بادشاہ محل کے اندر داخل ہو گیا کیا دیکھتا ہے کہ صاف شفاف خوان پوشوں سے ڈھکے بے شمار تھال میزوں پر سجا رکھے ہیں حملہ آور بادشاہ اپنے حریف کی مہمان نوازی کو دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ بھُوک تو لگ ہی رہی تھی۔ وہ لوگ کھانے کی میزوں کی طرف بڑھنے لگے۔ کھانے کے لیے جب خوان پوش ہٹائے گئے۔ تو دیکھا کہ بجائے کھانے پینے کی چیزوں کے تھال سونے چاندی، اشرفیوں اور جواہرات وغیرہ سے بھرے ہوئے ہیں۔ یہ دیکھ کر حملہ آور ہکّے بکّے رہ گئے۔ حیرانی کے عالم میں پُوچھا" آپ نے تو کھانے کی دعوت دی تھی پھر کھانا کہاں ہے۔ اور یہ سب کیا ہے؟"

میزبان بادشاہ نے عرض کی۔" حضور! روٹی تو آپ کے اپنے ملک میں بھی بہت تھی۔ آپ کے یہاں تکلیف فرمانے کی اصل وجہ تو یہ ہیرے اور جواہرات ہی ہیں۔ یہی سوچ کر مَیں نے مقابلہ کرنا واجب نہیں سمجھا تھا کہ جنگ کسی بھی صورت میں ہمارے مسائل حل نہیں کر سکتی۔ حکومتوں کے قاعدے قانون صرف بادشاہوں اور امیروں کے فائدے کے لیے ہوتے ہیں۔ لیکن سزا غریبوں کو بھُگتنی پڑتی ہے۔ جس جوش اور جذبے سے آپ نے حملہ کیا تھا۔ اگر مَیں بھی اسی طرح مقابلے کے لیے میدان میں اُتر آتا تو فصلیں تباہ ہو جاتیں، بستیاں اُجڑ جاتیں، ملک کی اینٹ سے اینٹ بج جاتی، ملک کمزور رعایا برباد ہو جاتی۔ نہ جانے کتنے لوگ زندگی بھر کے لیے اپاہج ہو جاتے۔ ہزاروں گھر بے چراغ، بچّے اور بوڑھے بے سہارا، عورتیں بیوہ ہو جاتیں۔ بے حساب مالی اور جانی نقصان ہوتا۔ انسان دوستی کے اس جذبے کے پیشِ نظر مَیں نے مقابلے سے

گریز کیا۔ اب آپ مجھے گرفتار کریں، قید میں ڈالیں اور چاہیں تو قتل کر دیں۔ اس کی مجھے قطعی پرواہ نہ ہوگی۔ شوق سے آپ یہ سب مال و متاع لے جائیں مگر میری رعایا کو کسی طرح کی تکلیف نہ پہنچائیں۔ انسان دوستی کا حق یہی ہے۔

حملہ آور بادشاہ بہت شرمندہ ہوا اور بغیر کچھ لیے واپس لوٹ گیا۔ انسان دوستی کے اس واقعہ نے اس کے دل پر ایسا گہرا اثر کیا کہ آئندہ اس نے جنگ سے توبہ کر لی اور اپنی رعایا کی بھلائی کے کاموں کی طرف مائل ہوا۔

مُسافر کی دُعا

لمبی سفید داڑھی والا ایک بُزرگ کمر باندھے ہوئے کسی لمبے سفر پر جا رہا تھا۔ چلتے چلتے وہ بہت تھک گیا تھا۔ یہاں تک کہ اس کے پاؤں سُوجنے لگے تھے۔ اُسے بھُوک بھی بہت زور سے لگ رہی تھی۔ پھر بھی وہ چلتا ہی جا رہا تھا۔ نہ جانے ابھی اسے کتنی دُور اور جانا تھا کہ سُورج غروب ہونے لگا۔ اتنے میں وہ ایک گاؤں میں پہنچ گیا۔ سوچنے لگا کہ آج رات یہیں کہیں آرام کرنا چاہیے۔ صبح تازہ دم ہو کر پھر آگے چلوں گا۔ یہی سوچ کر وہ ایک بڑے سے شاندار مکان پر گیا اور دروازے پر دستک دی۔

تھوڑی دیر میں ایک موٹی سی عورت نے دروازہ کھولتے ہی پُوچھا۔ "کون ہو تم؟ اور کیا چاہتے ہو؟"

اس بُزرگ نے بڑی نرمی سے جواب دیا۔ "مَیں ایک مسافر ہوں۔ بہت تھکا ہوا ہوں۔ آج کی رات آرام کرنے کے لیے اگر آپ مجھے اپنے گھر میں تھوڑی سی جگہ دے دیں تو بڑی مہربانی ہو گی۔"

عورت نے گرجتے ہوئے کہا۔ "دفع ہو جاؤ یہاں سے۔ اگر مَیں تمھارے جیسے ہر نکمے آدمی پر یُونہی مہربانی کرنے لگوں تو اپنے گھر کا خرچ کیسے پورا کر پاؤں گی۔"

بُوڑھا مسافر مایوس ہو کر آگے بڑھ گیا۔ اسی کے پڑوس میں ایک چھوٹا سا ٹوٹا پھُوٹا مکان تھا۔ اس نے اس مکان کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ ایک کمزور سی

بُڑھیا نے دروازہ کھولا اور بولی ۔ "آؤ بھائی! کہاں سے آئے ہو۔ کیا چاہیے۔"

مسافر بولا۔ "بڑی بی! مَیں ایک تھکا ہارا مسافر ہوں ۔ رات بسر کرنے کے لیے مجھے تھوڑی سی جگہ چاہیے ۔ اگر آپ . . . . ."

بُڑھیا نے بڑی نرمی سے کہا "آجاؤ بھائی! اس چھوٹے سے مکان میں پہلے بھی تو اتنے لوگ رہتے ہیں۔ تم بھی آجاؤ گے تو کیا فرق پڑے گا۔ آؤ، اندر چلے آؤ۔" مُسافر اندر آگیا تو اس عورت نے چارپائی پر بکھرے کپڑے سمیٹ کر ایک طرف رکھ دیے اور چارپائی مُسافر کے آرام کرنے کے لیے خالی کر دی ۔ مُسافر آرام سے چارپائی پر بیٹھ گیا۔

مسافر کی آدھی تھکان تو بُڑھیا کی نرمی اور فراخ دلی سے ہی اُتر چکی تھی ۔ اندر آکر وہ چارپائی پر لیٹا نہیں بلکہ بیٹھے بیٹھے اس چھوٹے سے گھر کا جائزہ لینے لگا۔ اس نے دیکھا کہ گھر میں چھوٹے ۔ بڑے کئی بچے ہیں ۔ سبھی نے پھٹے پُرانے کپڑے پہن رکھے ہیں ۔ یہ دیکھ کر مسافر نے پُوچھا۔ "اے نیک بخت عورت! تم اپنے بچّوں کے لیے نئے کپڑے کیوں نہیں بنا دیتیں ۔"

عورت نے ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ "بھائی! مَیں ایک غریب بیوہ ہوں ۔ محنت مزدوری کر کے کسی نہ کسی طرح ان کا پیٹ تو پالتی ہوں لیکن کپڑے بنانے کے لیے پیسے کہاں سے لاؤں ۔ اپنی طرف سے تو بہت کوشش کرتی ہوں لیکن پورا ہی نہیں پڑتا۔ خیر کھانے کا وقت ہو گیا ہے، آؤ جیسا بھی رُوکھا سُوکھا ہے، اسی میں شریک ہو جاؤ۔"

مسافر نے کنکھیوں سے دسترخوان پر نظر ڈالی تو دیکھا کہ تھوڑے سے چاول، کچھ روٹیاں اور پتلی سی دال رکھی ہے جو ان بچّوں کے لیے بھی کافی نہیں تھی ۔ یہ دیکھ کر اس نے کہا۔ "بڑی بی! کھانا تو میرے پاس تھا۔ جو تھوڑی دیر ہوئی مَیں

نے کھالیا ہے۔ اب مجھے بالکل بھوک نہیں ہے۔ بچّوں کے ساتھ تم کھانا کھاؤ۔ مَیں بہت تھکا ہوا ہوں۔ ذرا آرام کر لوں۔ یہ کہتے ہوئے وہ لیٹ گیا۔ اور کچھ ہی دیر میں خرّاٹے بھرنے لگا۔ صبح اُٹھتے ہی بُڑھیا سے کہا "بڑی بی! تم نے ایک تھکے ہارے مُسافر کو رات بھر آرام کرنے کے لیے جگہ دے کر بڑا ثواب کمایا ہے۔ مَیں تمھاری مہمان نوازی کا بہت شُکر گزار ہوں۔ دُعا کرتا ہوں کہ خُدا کرے تم جو بھی کام آج صُبح شروع کرو، وہی شام تک کرتی رہو۔"

یہ سُن کر بُڑھیا نے مُسکراتے ہوئے کہا۔ "اے مہربان بھائی! تمھاری دُعا کے بغیر بھی تو مَیں سارا دن کام کرتی رہتی ہوں۔ صُبح اُٹھتے ہی کام میں مصروف ہو جاتی ہوں اور رات گئے تک لگی رہتی ہوں۔ لیکن کام ہے کہ پھر بھی ختم ہونے میں نہیں آتا۔ جب اس نے آنکھیں اُٹھا کر دیکھا تو مُسافر جا چُکا تھا۔

مُسافر کے چلے جانے کے بعد اس عورت نے بچّوں کی طرف دیکھا اور سوچنے لگی کہ مُسافر ٹھیک ہی تو کہتا تھا۔ ان کے کپڑے واقعی چیتھڑے ہو رہے ہیں۔ بچّے آخر بالکل لاوارث تو نہیں ہیں۔ ان کی ماں ابھی زندہ ہے۔ گھر میں کپڑے کا ایک ٹکڑا پڑا تو ہے۔ سب کے نہ سہی، جس کسی کے ناپ کا بن سکے بنا دیتی ہوں۔ ذرا ناپ کر تو دیکھوں۔ شاید بڑے بچّے کا کُرتا ہی بن جائے۔

یہی سوچ کر وہ پڑوسن کے ہاں سے کپڑا ناپنے کا فیتہ مانگ لائی۔ واپس آکر اس نے ٹرنک سے کپڑے کا وہ ٹکڑا نکالا اور بڑے بچّے کے کُرتے کے لیے اس میں سے ڈیڑھ گز کپڑا ناپ لیا۔ یہ دیکھ کر وہ بہت حیران ہوئی کہ کپڑا اب بھی اتنا ہی موجود تھا۔ اس نے دوسرے بچّے کے کُرتے کے لیے بھی کپڑا ناپ لیا۔ مگر کپڑا پھر بھی اتنا ہی تھا۔ اس کے بعد وہ سبھی بچّوں کے

لیے ناپ کر کپڑا رکھتی گئی۔ یہاں تک کہ سینکڑوں بار ناپنے کے بعد بھی کپڑے کا ٹکڑا بدستور اتنا ہی باقی رہتا۔ فرش پر نپے ہوئے کپڑے کا ڈھیر لگ گیا۔ پھر بھی وہ ٹکڑا ختم ہونے میں نہ آیا۔ لیکن جیسے ہی سورج غروب ہوگیا۔ کپڑا بھی ختم ہوگیا۔

عین اسی وقت کسی نے اس کے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ کھول کر دیکھا تو پڑوسن اپنا فیتہ واپس لینے آئی تھی۔ اسے دراصل فیتے کی تو کوئی ضرورت نہیں تھی۔ وہ محض یہ جاننے کے لیے بے چین تھی کہ اس غریب عورت کے پاس ناپنے کے لیے ایسی کون سی چیز آگئی ہے۔ جو ابھی تک فیتہ واپس کرنے نہیں آئی۔ اب جو اس نے دیکھا تو اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ سارا گھر نئے اور بڑھیا کپڑوں سے بھرا پڑا ہے۔ حیران ہوکر وہ پوچھنے لگی "اری بڑی بی، اتنا سارا کپڑا آج تمھارے پاس کہاں سے آگیا۔

غریب عورت نے جواب دیا۔ "بہن یہی تو خود میری سمجھ میں بھی نہیں آتا۔ کپڑے کا ایک ٹکڑا بڑا تھا جسے ناپ کر میں یہ جاننا چاہتی کہ کیا اس سے بڑے بچے کا کرتا بن سکتا ہے یا نہیں۔ مگر اسی ٹکڑے کو ناپتے ناپتے شام ہوگئی۔ تب کہیں جاکر وہ ٹکڑا ختم ہونے میں آیا ہے۔ وہ بزرگ مسافر واقعی کوئی پہنچا ہوا آدمی تھا۔ جس نے جاتے جاتے مجھے یہ دعا دی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا کہ "میں ہر دوار جا رہا ہوں"۔

"کون مسافر، اور کیسی دعا"۔ امیر پڑوسن نے ہڑبڑاتے ہوئے پوچھا۔ غریب عورت نے جب سارا قصہ سنایا تو امیر پڑوسن نے سر پیٹ لیا۔ وہی مسافر پہلے اسی کے گھر پر گیا تھا جسے اس نے دھتکار دیا تھا۔ اب وہ اپنے

کیے پر بہت پشیمان ہو رہی تھی۔ اپنے گھر واپس آ کر اس نے نوکر کو حکم دیا۔
"فوراً جاؤ اور اس مُسافر کو ڈھونڈ کر لاؤ۔ جب تک وہ نہ ملے تم بھی واپس نہ لوٹنا۔"

اگلے دن صُبح سویرے نوکر گھوڑے پر سوار ہو کر مُسافر کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ اور دوپہر تک اس نے اس مُسافر کو تلاش کر لیا۔ اور تصدیق کے لیے اس سے پُوچھا۔ "بابا آپ ہردوار جا رہے ہیں کیا؟"

"تو کیا آپ اس سے پچھلی رات فلاں گاؤں میں ایک بیوہ عورت کے گھر میں بھی ٹھہرے تھے۔" نوکر نے پھر پُوچھا۔ مُسافر نے جب "ہاں" میں جواب دیا تو نوکر نے کہا کہ "میری مالکن کو آپ سے کچھ ضروری کام ہے۔ آپ میرے ساتھ واپس چلیں۔"

مُسافر نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا "کون مالکن؟ اور کیا کام ہے؟"

نوکر نے جب اس کا حوالہ دیا تو مُسافر نے اس کے ساتھ چلنے سے انکار کر دیا۔ نوکر نے التجا کی۔

"اے مُسافر اگر آپ میرے ساتھ نہیں چلیں گے تو وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گی۔"

"اچھا! اگر یہ بات ہے تو میں ضرور چلوں گا۔" یہ کہہ کر مُسافر نوکر کے ساتھ ہی گھوڑے پر بیٹھ گیا۔

نوکر کے چلے جانے کے بعد امیر عورت نے بہت عُمدہ اور لذیذ کھانے تیار کرنے شروع کر دیے تھے۔ اور مُسافر کی خاطر تواضع کے لیے سبھی انتظام پورے کر لیے تھے۔ جب مُسافر واپس آیا تو امیر عورت بہت خوش ہوئی۔ اس کی خاطر تواضع میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ اس کے آرام کرنے کے لیے صاف سُتھرا

نرم نرم بستر بچھایا گیا۔ اور نوکر کو اُسے آرام سے رکھنے کا حکم دیا۔ مُسافر تین چار دِن تک وہیں ٹھہرا رہا۔ اِس دوران اس عورت نے اُسے جانے کے لیے تو نہیں کہا البتہ کھانے پینے میں ہر روز فرق پڑتا گیا۔ یہاں تک کہ چوتھے دن ناشتے میں چائے کے ساتھ کچھ بھی کھانے کو نہ دیا۔ یہ دیکھ کر مُسافر نے اب وہاں سے چلے جانا ہی مُناسب سمجھا اور مالکن کو بُلا کر جانے کی اجازت چاہی۔

امیر عورت یہ سُن کر بہت خوش ہوئی اور مُسافر کو مزید رُکنے کے لیے بھی نہ کہا۔ اور مُسافر کو پھاٹک تک چھوڑنے چلی گئی۔ مُسافر چُپ چاپ جا رہا تھا۔ امیر عورت سے رہا نہ گیا اور بولی۔ "اے نیک مُسافر! کیا جاتے جاتے مجھے کوئی دُعا نہ دو گے؟"

مُسافر نے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

"مَیں آپ کا بہت شکر گزار ہوں۔ اور دُعا کرتا ہوں کہ آپ جو کام صُبح شروع کریں شام تک وہی کرتی رہیں۔" عورت کی دِلی تمنا پوری ہو گئی۔ خوشی سے جھومتی ہوئی وہ مکان کے اندر آئی اور کپڑے کا سب سے بڑھیا اور بڑا سا ٹکڑا ٹرنک سے نکال کر سوچنے لگی "کتنا لاجواب کپڑا ہے۔ اب میں شام تک اسے ناپتی رہوں گی۔ اور کپڑا ختم ہونے میں نہیں آئے گا۔ اس طرح سے میرے پاس اس عُمدہ کپڑے کے کئی تھان جمع ہو جائیں گے۔ سب سے پہلے تو مَیں اپنے اور اپنی بیٹی کے لیے نئے نئے فیشن کے کپڑے تیار کراؤں گی اور فالتو کپڑے کو بیچ کر ہزاروں روپے بھی کما لوں گی۔" اس نے کپڑے کو میز پر رکھا اور دوسرے کمرے سے ناپنے کا فیتہ لینے چلی گئی۔ اس

سے پہلے کہ وہ فیتے کو ہاتھ لگاتی اسے یاد آیا کہ رات کا بچا ہوا آٹا رکھا ہے۔ اگر یونہی پڑا رہا تو کھٹا ہو جائے گا۔ کیوں نہ پہلے نوکر کے لیے روٹی پکا دوں اور پھر اطمیناں سے سارے دن کپڑا ناپتی رہوں۔

فیتے کو وہیں چھوڑ کر وہ باورچی خانے میں چلی گئی۔ تنور نوکر نے بنا ہی رکھا تھا۔ کام جلدی ختم کرنے کے لیے اس نے آگ کو اور بھی تیز کر دیا۔ اور خود اس باسی آٹے کو ذرا اور گوندھ کر نرم کرنے میں لگ گئی۔ تھوڑی ہی دیر میں اس نے کئی روٹیاں تنور میں لگا دیں۔ تنور چوں کہ ضرورت سے زیادہ تپ چکا تھا، سبھی روٹیاں جل کر کوئلہ ہو گئیں۔ اس نے روٹیوں کا دوسرا پور تنور میں لگا دیا۔ اس بار بھی جب روٹیاں تنور سے نکالیں تو وہ بھی جلی ہوئی تھیں۔ چنانچہ روٹیاں بنا بنا کر وہ تنور میں لگاتی رہی اور ہر بار جلی ہوئی روٹیاں تنور سے نکال کر پھینکتی رہی۔ نہ آٹا ختم ہونے میں آتا تھا، نہ تنور کی آنچ ہی کم ہوتی تھی۔ اور نہ ہی وہ روٹیاں بنانا بند کرتی تھی۔ حالانکہ وہ تھک کر چُور ہو گئی تھی پھر بھی نہ جانے کیوں روٹیاں بنانا بند نہیں کر سکتی تھی۔ اسے یُوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی غیبی طاقت اسے اس کام کو جاری رکھنے پر مجبور کر رہی ہو۔ اس کے ہاتھ مشین کی طرح خود بخود کام کرتے جا رہے تھے۔ وہ دِن بھر روٹیاں بنا بنا کر جلاتی رہی۔ نہ صرف باورچی خانے میں بلکہ برآمدے کے فرش پر بھی جلی ہوئی روٹیوں

کے ڈھیر لگ گئے۔

جیسے ہی سورج غروب ہوا نہ صرف تسلے میں سے آٹا ختم ہو گیا بلکہ تنور بھی ٹھنڈا پڑ گیا۔ جلی ہوئی روٹیوں کے ڈھیر کے پاس بیٹھی وہ کافی دیر تک مسافر اور اس کی دعا کو کوستی رہی۔

کیسی بلندی کیسی پستی

ایک مُلک کا راجا بہت نیک اور رحم دِل تھا۔ وہ کسی کے ساتھ ناانصافی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ لوگ اگرچہ خوش حال تھے پھر بھی وہ ہر وقت اپنی پرجا کی بھلائی کے لیے سوچتا رہتا تھا۔ پرجا کے مُفاد کے خلاف کوئی بات اگر اسے خواب میں بھی دِکھائی پڑ جاتی تو مہینوں بے چین رہتا تھا۔ اور جب تک پوری طرح سے مُطمئن نہ ہو جاتا اس خواب کی تعبیریں پُوچھتا رہتا۔

ایک رات راجا نے خواب میں دیکھا کہ ایک خوف ناک بھیڑیا اس کے سر پر سوار ہے۔ اور اس پر اس طرح حاوی ہوتا جا رہا ہے کہ راجا اپنے آپ کو بے بس محسوس کرنے لگا ہے۔ جب آنکھ کُھلی تو راجا کو بہت ڈر لگا اور وہ اس خواب کی تعبیر کے لیے فکر مند رہنے لگا۔ آخر ایک دن اس نے اعلان کر دیا کہ جو شخص اسے اس خواب کی صحیح تعبیر بتائے گا، راجا اسے مُنہ مانگا انعام دے کر مالا مال کر دے گا۔ یکے بعد دیگرے کئی جیوتشی، نجومی اور دانا لوگ راجا کے خواب کی تعبیر بتانے کے لیے دربار میں حاضر ہوئے لیکن کوئی بھی راجا کو مُطمئن نہ کر سکا۔ راجا کی پریشانی دِن بدن بڑھنے لگی۔

ایک دن ایک آدمی راجدھانی سے دُور ایک جنگل میں سے گزر رہا تھا۔ اچانک ایک خطرناک سانپ نے اس کا راستہ روک لیا۔ اس آدمی کو اپنی جان کے لالے پڑ گئے۔ بچاؤ کا کوئی راستہ نہ پا کر وہ سوچنے لگا کہ شاید موت ہی اسے گھیر کر اِدھر لے آئی ہے اور اب وہ چند لمحوں کا مہمان ہے۔ موت کے انتظار میں وہ لاچار اور بے بس سانپ کے سامنے کھڑا تھا کہ سانپ اس کی طرف رینگنے لگا۔ اور اس آدمی کی بدحواسی بڑھنے لگی لیکن سانپ جب اس آدمی کے پاس آگیا تو کہنے لگا۔ ”بھائی مَیں جانتا ہوں کہ تم ایک غریب آدمی ہو۔ مجھے بھی تمھاری غریبی پر رحم آتا ہے لیکن سوچ رہا ہوں کہ تمھاری مدد کیسے کروں۔ ہاں پہلے یہ بتاؤ کہ تمھارا نام کیا ہے۔“

”نندو“ غریب آدمی نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا۔

”تو نندو سُنو!“ سانپ پھر کہنے لگا۔ ”یاد آگیا۔ آج کل راجا ایک خواب کی تعبیر جاننے کے لیے بے چین ہے۔ مَیں تمھیں راجا کے خواب کی تعبیر بتائے دیتا ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ تمھیں اس قدر انعام دے کہ اس سے تمھارے دن پھر جائیں۔ مگر تم مجھے مت بھُول جانا۔ وعدہ کرو کہ راجا کی طرف سے تمھیں جو بھی انعام ملے گا“ اس میں سے آدھا مجھے دو گے۔“

”ناگ دیوتا! مَیں بھگوان کو حاضر ناظر سمجھ کر وعدہ کرتا ہوں کہ ایسا ہی ہو گا“ نندو نے کہا۔

وعدہ لے کر سانپ نے نندو کو راجا کے خواب کی تعبیر بتا دی۔ نندو خوشی خوشی پہلے تو اپنے گھر واپس آیا۔ پھر صاف سُتھرے کپڑے پہن کر راجا کے دربار کی طرف چل دیا۔ جب وہ دربار میں پہنچا تو دربان نے راجا کو خبر پہنچائی کہ ایک شخص آپ کے خواب کی تعبیر بتانے کے لیے حاضر ہوا ہے۔ حکم ہو تو اُسے پیش

کیا جائے۔" راجا نے اُسے اندر بُلا لانے کا حکم دیا۔
اندر جا کر نندو نے جھک کر راجا کو نمسکار کی اور چُپ چاپ کھڑا ہو گیا۔ راجا نے اسے گدّی کے ساتھ پڑی ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ تو وہ راجا کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کرسی پر بیٹھ گیا۔ راجا نے نندو سے اس کا نام اور پتہ دریافت کیا۔ جب نندو نے اپنا نام اور پتہ بتا دیا تو راجا نے اپنا خواب بیان کرنا شروع کیا۔ راجا جب اپنا خواب بیان کر چکا تو نندو نے ہاتھ جوڑ کر عرض کی۔ "حضور! اس خواب میں مہاراج کو محتاط رہنے کا اشارہ ملتا ہے۔ آنے والا سال بڑا ہی بُرا ہوگا۔ اس میں دھوکا، جھوٹ، فریب، مکّاری اور دغابازی کا بول بالا ہوگا۔ آپ اپنے کسی وزیر، درباری یہاں تک کہ کسی رانی یا راج کمار کی بات پر بھی بغیر سوچے سمجھے یقین نہ کیجیے گا۔ اور معاملے کی اُونچ نیچ پر غور کر کے ہی فیصلہ اور عمل کیجیے گا۔"
یہ تعبیر بادشاہ کو بہت پسند آئی اور اس نے غریب نندو کو بہت سا انعام دے کر رُخصت کیا۔ اتنا زیادہ انعام پا کر نندو کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔ اور وہ وہیں کھڑے کھڑے مستقبل کے لیے بہت سی اِسکیمیں سوچنے لگا۔ دوسرے ہی لمحے جب اسے آدھا انعام ناگ دیوتا کی بھینٹ چڑھانے کا خیال آیا تو اس کی نیت بدل گئی۔ اور پورا انعام ہڑپ کرنے کے لیے اس نے کسی دوسرے راستے سے گھر پہنچنے کی تدبیر سوچی۔ وہ راستہ بدل کر گھر پہنچ گیا اور سانپ اس کا انتظار کرتا رہا۔
کچھ ہی عرصے بعد راجا نے پھر ایک بھیانک خواب دیکھا کہ ایک ننگی تلوار اس کے سر پر لٹک رہی ہے۔ راجا اس خواب کی بھی تعبیر جاننے کے لیے بے قرار ہو اُٹھا۔ کسی اور جیوتشی یا نجومی پر اب اسے اعتقاد نہ رہا تھا۔ لہٰذا اس نے اپنے مُلازموں کو حکم دیا کہ وہ اسی نندو کو تلاش کر کے لائیں۔ راجا کو یقین تھا کہ وہی ایک شخص اس کے خواب کی صحیح تعبیر بتا سکتا ہے۔

راجا کے آدمی پُوچھتے پُوچھتے نندو کے گھر پہنچ گئے۔ اور بتایا کہ راجا نے اسے پھر یاد کیا ہے۔ یہ سُن کر نندو بہت پریشان ہوا۔ اور ناگ دیوتا کے ساتھ اس نے جو وعدہ خلافی کی تھی اس پر پچھتانے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اب وہ ناگ دیوتا کے پاس کیسے جائے اور راجا کو کیوں کر مُنہ دِکھائے۔ آخر اس نے یہ فیصلہ کیا کہ راجا کے ہاتھوں مرنے کی بجائے وہ ناگ دیوتا کے غُصّے کا شکار ہو جائے گا۔ اور راجا کے دربار میں جانے سے پہلے ناگ دیوتا کے درشن کرنے کی کوشش ضرور کرے گا۔ یہی سوچ کر اس نے راجا کے آدمیوں سے کہا کہ "آپ جائیے اور راجا کو بتا دیجیے کہ پُوجا پاٹ کر کے مَیں ابھی حاضر ہوتا ہوں۔"

راجا کے نوکر چلے گئے تو نندو نے بھی کپڑے پہنے اور بھگوان کا نام لے کر جنگل کے اسی راستے پر ہو لیا۔ وہ سوچتا جا رہا تھا کہ ہو سکتا ہے ناگ دیوتا درشن ہی نہ دے اور اگر درشن دے تو نہ جانے اس کے ساتھ کیا سلوک کرے۔ اسی ادھیڑ بن میں جب وہ ٹھیک اسی جگہ پر پہنچ گیا تو سانپ اپنی بابنی سے نکل کر پھر اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ نندو کے اوسان خطا ہونے لگے۔ وہ کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ سانپ بولا "گھبراؤ نہیں نندو، راجا نے تمہیں پھر ایک خواب کی تعبیر پُوچھنے کے لیے بُلایا ہے۔ لو مَیں تمہیں اس خواب کی تعبیر بھی بتا دیتا ہوں۔" یہ کہہ کر سانپ نے اسے راجا کے نئے خواب کی تعبیر بتا دی۔

نندو کا سر ندامت سے جُھک گیا۔ اور معذرت کے طور پر کہنے لگا۔ "ناگ دیوتا! مَیں اپنی حرکت پر بہت شرمندہ ہوں۔ لالچ نے میری عقل پر پردہ ڈال دیا تھا۔ اب کے جو بھی انعام ملے گا اس میں سے آدھا آپ کی بھینٹ چڑھا کر ہی گھر جاؤں گا۔"

"بھائی! مجھے اپنے حِصّے کا کوئی دُکھ نہیں تھا۔ البتہ تمہاری وعدہ خلافی پر

واقعی بہت افسوس ہوا تھا۔ خیر جو ہونا تھا ہو چکا۔ آئندہ تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے۔"
یہ کہتے ہوئے سانپ نے نندو کو وداع کیا۔

نندو خوشی خوشی راجا کے دربار کی طرف چل پڑا۔ نندو کے آنے کی خبر پا کر راجا نے اُسے فوراً اندر بُلا لیا۔ اور پُوچھا۔ "نندو! راستے میں تمہیں کوئی تکلیف تو نہیں اُٹھانی پڑی؟"

"نہیں مہاراج! آپ کی مہربانی سے میں بالکل خیریت سے پہنچ گیا ہوں۔ فرمائیے میرے لیے کیا حُکم ہے۔" نندو نے کہا۔

راجا نے اپنا خواب بتا کر اس کی تعبیر پُوچھی۔ نندو نے بڑے ادب سے جواب دیا۔

"مہاراج! گُستاخی معاف، ہو تو عرض ہے کہ یہ خواب عنقریب ہونے والی ایک خون ریز جنگ سے مہاراج کو خبردار کرتا ہے۔ حضور کو ابھی سے تیاری شروع کر دینی چاہیے۔ اس ہونے والی جنگ میں فتح چوں کہ آپ ہی کی ہو گی اس لیے زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔

راجا نے خوش ہو کر نندو کو پہلے سے بھی زیادہ انعام و اکرام دیا۔ اب کے انعام میں ایک قیمتی تلوار بھی تھی۔ نندو اتنا سارا انعام پا کر خوشی سے پُھولا نہ سمایا۔ وہ راجہ کا شُکریہ ادا کرتے ہوئے وہاں سے رُخصت ہوا۔ اور جنگل کے راستے سے گھر لوٹنے کا فیصلہ کیا۔ تھوڑی ہی دُور گیا تھا کہ اس کی نیت پھر بدلنے لگی۔ اتنے میں کیا دیکھتا ہے کہ سانپ بھی لہراتا ہوا چلا آرہا ہے۔ یہ دیکھ کر نندو نے تلوار کو فوراً نیام سے باہر نکال لیا۔ سانپ نندو کی اس حرکت کو دیکھ کر خبردار ہو گیا۔ جب سانپ پاس آگیا تو اس نے سانپ پر وار کیا۔ وار بچا کر سانپ بھاگ گیا۔

سانپ کی بتائی ہوئی تعبیر کے مطابق کچھ ہی مہینوں بعد واقعی ایک خوف ناک جنگ چھڑ گئی۔ بڑی تباہی مچی۔ بہت سی جانیں گئیں، اور مالی نقصان بھی ہوا۔ لیکن فتح راجا ہی کی ہوئی۔ جنگ کے بعد رفتہ رفتہ مُلک بھر میں پھر امن بحال ہو گیا۔ وقت گزرتا گیا۔ کچھ عرصے بعد راجا نے پھر ایک خواب دیکھا۔ کہ اس کے محل کے سامنے ایک بھیڑ اور بھیڑیا آپس میں مل کر کھیل رہے ہیں۔ نیند سے بیدار ہو کر راجا سوچنے لگا کہ بھیڑیا تو بھیڑ کا جانی دشمن ہے۔ پھر خواب میں اس بے جوڑ دوستی کے کیا معنی؟ ضرور کوئی سازش ہو رہی ہوگی۔ اس نے پھر نندو کو بُلانے کا حکم دیا۔

اس بار راجا کا پیغام پا کر نندو کو بڑی گھبراہٹ ہوئی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ پہلی بار تو سانپ کے ساتھ صرف دھوکا اور وعدہ خلافی ہی کی تھی جس کی تلافی کے لیے کوئی بھی عذر پیش کیا جا سکتا تھا لیکن دوسری بار تو ناگ دیوتا پر تلوار سے وار کر کے وہ اپنی محسن کشی کا ثبوت بھی دے چکا ہے۔ وہ بھی کتنا احسان فراموش ہے۔ جس کی بدولت اس کے دن پھرے تھے اسی کی جان کا دشمن بن گیا تھا۔ اب تو ناگ دیوتا اسے کسی بھی قیمت پر نہیں بخشے گا۔ اسے چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا دِکھائی دینے لگا۔

اُدھر راجا کا حکم بھی ٹالا نہیں جا سکتا تھا۔ چار و ناچار اپنے آپ کو مرضی الٰہی کے سپرد کر کے جنگل ہی کے راستے سے راج محل کی طرف چل دیا۔ جیسے جیسے وہ سانپ کی بانبی کے قریب پہنچتا جاتا تھا۔ اس کا دم خشک ہوتا جا رہا تھا۔ اچانک اس نے دیکھا تو سانپ پھر اس کے سامنے

کھڑا تھا۔ قریب تھا کہ وہ بے ہوش ہو کر گر پڑے کہ سانپ نے کہا۔ "گھبراؤ نہیں دوست! مَیں پھر تمھاری مدد کے لیے آگیا ہوں!"

اس سے پہلے کہ نندو اپنی ندامت کے اظہار کے لیے کچھ کہتا۔ سانپ نے پھر اُسے راجا کے خواب کی تعبیر بتا دی۔ اور نندو اپنے کیے پر آنسو بہاتا راج محل کی طرف روانہ ہوگیا۔ راجا اسی کی راہ دیکھ رہا تھا۔ نندو کو دیکھ کر راجا کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ اس نے نندو کو اپنے پاس بٹھا کر جو کچھ خواب میں دیکھا تھا، بیان کرنا شروع کیا۔ راجا جب اپنا خواب بیان کر چُکا تو نندو نے کہا۔ "مبارک ہو مہاراج! آپ نے بہت اچھا خواب دیکھا ہے۔ آنے والے سال میں امن اور خوشحالی کا دَور دورہ ہوگا۔ کسی کو کسی سے کوئی شکایت اور عداوت نہیں رہے گی۔ راجا بے فکر اور پرجا سُکھی رہے گی۔ یہاں تک کہ شیر اور بکری، بھیڑ اور بھیڑیا سبھی ایک گھاٹ پانی پئیں گے!"

یہ سُن کر راجا بے حد خوش ہوا۔ اور نندو کو معمول سے زیادہ انعام دیا۔ اس بار نندو کو ایک گھوڑا بھی انعام میں ملا۔ راجا سے رُخصت ہو کر وہ گھوڑے پر سوار ہوا اور سیدھا ناگ دیوتا کی بانبی کی طرف چل دیا۔ سانپ کو جیسے پتہ لگ گیا ہو کہ اس بار نندو ضرور آئے گا وہ پہلے ہی سے اس کی انتظار میں کھڑا تھا۔ جاتے ہی نندو نے گڑگڑا کر معافی مانگتے ہوئے ناگ دیوتا کو نمشکار کی اور انعام کا آدھا حصّہ پیش کرتے ہوئے بولا۔ "ناگ دیوتا! کچھ دیر اور میرا انتظار کیجیے۔ اس سے پہلے ملے ہوئے انعامات میں سے بھی آپ کا حصّہ لے کر ابھی حاضر ہوتا ہوں!"

ناگ دیوتا نے کہا۔ "سنو! اس تکلف کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں دولت کا بھوکا نہیں ہوں۔ یہ مال اور دولت تمہیں ہی مبارک ہو۔ اسے اٹھاؤ اور لے جاؤ، مجھے نہیں چاہیے۔ مجھے تو صرف پرکھنا تھا کہ آخر تمھارا اپنا بھی کوئی کردار ہے۔ اب تو مجھے بخوبی معلوم ہو گیا ہے کہ عام آدمی کی طرح تم بھی کردار کی پستی کے شکار ہو اور اپنی فطری خود غرضی کے خول سے باہر نہیں نکل سکے۔ اسی لیے اتنی مہربانیوں کے باوجود تم نے مجھے کسی خوش سلوکی کا مستحق نہ سمجھا۔"

سیر کو سوا سیر

ایک دفعہ گاؤں کی ایک بڑھیا کسی ضرورت سے شہر جا رہی تھی۔ راستے میں اسے دو چال باز ٹھگ مل گئے۔ ٹھگوں کو پتہ چل گیا کہ بڑھیا مالدار آسامی ہے۔ وہ اس کے پیچھے لگ گئے۔ اور اس سے مال ہتھیانے کی ترکیبیں سوچنے لگے۔ ادھر بڑھیا نے بھی تو دھوپ میں بال سفید نہیں کیے تھے۔ وہ ان ٹھگوں سے خبردار ہو کر اپنے راستے پر چلتی گئی۔

تیز تیز قدم اٹھا کر ٹھگ جلدی ہی بڑھیا سے جا ملے اور بڑے ادب سے سلام کرتے ہوئے پوچھنے لگے۔ "نانی اماں! کہاں جا رہی ہو؟"

"جیتے رہو بیٹا! یہیں شہر تک جا رہی ہوں۔" بڑھیا نے جواب دیا۔

"ہم بھی شہر ہی جا رہے ہیں۔ اچھا ہوا آپ مل گئیں۔ چلیے باتیں کرتے کرتے راستہ آسانی سے کٹ جائے گا۔ شہر میں کچھ کام ہے کیا؟" ایک ٹھگ نے پوچھا۔

"بیٹی کی شادی جو کرنی ہے۔ دن رات فکر لگی رہتی ہے۔ مہنگائی کے زمانے میں خرچ ہی پورے نہیں ہوتے۔ دو ایک زیور رکھے ہوئے تھے۔ سوچا انھیں ہی بیچ کر کچھ خرچ پورے کیے جائیں۔" بڑھیا نے کہا۔

"کیوں نہیں، زیور تو بنائے ہی اسی لیے جاتے ہیں کہ آڑے وقت میں کام آئیں۔" دوسرے ٹھگ نے کہا۔ "اچھا نانی اماں! کوئی اچھی سی کہانی سناؤ تاکہ سفر کٹ جائے۔"

بڑھیا نے کہا۔ "بات تو ٹھیک ہے لیکن اس وقت مجھے کوئی اچھی کہانی یاد نہیں آ رہی۔ پہلے تم شروع کرو۔ اتنے میں مجھے بھی کوئی کہانی یاد آ جائے گی، تو سناؤں گی۔"

پہلے ٹھگ نے کہا۔ "نانی اماں! جگ بیتی کہانیاں سنتے سنتے جی بھر گیا ہے۔ اس وقت میں آپ کو ایک آپ بیتی سناتا ہوں۔ لیکن اگر آپ نے اس واقعہ کو جھوٹ سمجھا تو اپنا ایک زیور ہمیں دینا پڑے گا۔"

بڑھیا تو پہلے ہی خبردار ہو چکی تھی۔ یہ سن کر ٹھگوں کی نیت کو اور بھی اچھی طرح سے بھانپ گئی۔ سوچنے لگی کہ مکار خواہ کتنی ہی شرافت کیوں نہ دکھائیں ان سے غافل نہ رہنا چاہیے۔ پھر ذرا ہوشیار ہو کر بولی "ہاں بیٹا! اگر واقعہ سچا ہوگا تو میں اُسے جھوٹ کیوں سمجھوں گی۔ خیر مجھے تمھاری بات منظور ہے۔ تم اپنی کہانی شروع کرو۔ کسی طرح راستہ تو کٹے۔"

ٹھگ آپ بیتی سنانے لگا۔ "نانی اماں! میرے بچپن کا واقعہ ہے۔ کہ اسی طرح میں ایک گلی میں جا رہا تھا۔ راستے میں لکڑی کی ایک گیند پڑی مل گئی۔ جونہی میں نے اسے ٹھوکر ماری، جادو کی وہ گیند پھٹ گئی۔ اور ایک جن اس میں سے نکل کر آسمان کی طرف اُڑنے لگا۔ وہ اونچے ہی اونچے اُڑتا جا رہا تھا۔ میں ٹکٹکی باندھے اُسے دیکھتا رہا۔ پھر یکایک وہ میری آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ آسمان سے نگاہ ہٹا کر میں نے زمین پر پڑی گیند کی طرف دیکھا تو وہی جن پھٹی ہوئی گیند کے پاس کھڑا تھا۔ جوں ہی میں نے جن کی طرف دیکھا وہ آنکھوں کے

راستے میرے جسم میں سمانے لگا۔ جن کا میرے جسم میں سمانا تھا کہ مَیں بھی اپنے اندر اُڑنے کی طاقت محسوس کرنے لگا۔ اور کچھ ہی دیر بعد مَیں خود بھی آسمان کی بلندیوں پر اُڑ رہا تھا۔ اُڑتے اُڑتے میری مُٹھ بھیڑ ایک عقاب سے ہو گئی۔ عقاب نے ایک ہی جھپٹے میں میری دونوں آنکھیں نکال لیں۔ اور چونچیں مار مار کر مجھے ایک سمندر میں گرا دیا۔"

کہانی کے اثر کا اندازہ لگانے کے لیے۔ یہاں پہنچ کر ٹھگ نے بُڑھیا سے پُوچھا "کیوں نانی اماں! مَیں جھُوٹ تو نہیں بک رہا ہوں"۔ بُڑھیا نے کہا "مجھے یقین ہے بیٹا! تم بھلا جھُوٹ کیوں بولنے لگے۔ زندگی میں انسان کو ایسے ہی واقعات سے گزرنا پڑتا ہے۔ تم بالکل سچ کہہ رہے ہو۔ ہاں! آگے کہو کہ سمندر میں سے تم زندہ کیسے بچ نِکلے۔

ٹھگ نے اپنی کہانی پھر شروع کرتے ہوئے کہا۔ "جیسے ہی میں سمندر میں گرا مجھے ایسا محسوس ہونے لگا میرا قد بڑھنے لگا ہے۔ احساس کی یہ منزل ابھی شروع ہی ہوئی تھی کہ ایک بہت بڑی مچھلی اپنا خوف ناک مُنہ کھولے میری طرف بڑھنے لگی۔ اور دوسرے ہی لمحے اس نے مجھے نِگل لیا۔ اتفاق سے جلد ہی وہ مچھلی ایک ماہی گیر کے جال میں جا پھنسی۔ ماہی گیر اپنی بڑی مچھلی پاکر بہت خوش ہوا۔ اسی دن شہر کے ڈپٹی کمشنر کے ہاں ایک شان دار دعوت کا انتظام کیا جا رہا تھا۔ اور اس دعوت کے لیے مچھلی فراہم کرنے کا کام اسی ماہی گیر کو سونپا گیا تھا۔ ماہی گیر نے اس مچھلی کو زندہ ہی اپنے ریڑھے پر لادا اور ڈپٹی کمشنر کے ہاں پہنچ گیا۔ اس قدر عُمدہ اور بڑی مچھلی دیکھ کر ڈپٹی کمشنر نے مچھلی کے علاوہ ماہی گیر کو انعام بھی دیا اور اسی وقت باورچی کو بُلا کر حکم دیا کہ مچھلی کو اچھی طرح صاف کرکے ایسا لذیذ پکایا جائے

کہ مہمان مدّتوں اس دعوت کا مزہ یاد رکھیں۔

مچھلی کی صفائی کے لیے باورچی ابھی اپنے اوزار ہی سنبھال رہا تھا کہ لپک کر مچھلی نے باورچی کو پکڑ لیا اور دوسرے ہی لمحے اسے بھی زندہ نگل گئی۔ باورچی کے معاونوں نے شور مچایا تو صاحب بہادر بھی موقعے پر آپہنچے۔ صاحب نے فوراً ایک جرّاح کو بُلا کر ساری حقیقت بیان کرتے ہوئے کہا کہ مچھلی کا پیٹ آہستہ آہستہ اس قدر احتیاط سے چاک کیا جائے کہ باورچی صحیح سلامت باہر نکل آئے۔ جب مچھلی کا پیٹ چاک کیا گیا تو باورچی کے ساتھ میں بھی صحیح سلامت باہر نکل آیا۔ اچنبھے کی بات تو یہ تھی کہ میری آنکھیں بھی بالکل ٹھیک ہو چکی تھیں۔ اب تو مَیں بھی دعوت کے انتظام کی ساری چہل پہل اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ باورچی کے ساتھ مجھے بھی دیکھ کر لوگ بہت حیران ہوئے کہ مچھلی کے پیٹ میں جا کر باورچی ایک سے دو کیسے ہو گئے۔ میری آپ بیتی سُن کر صاحب مجھ پر بڑے مہربان ہو گئے۔ انھوں نے پہننے کے لیے مجھے خوب اچھے اچھے کپڑے دیے۔ اور اس دعوت میں بھی شریک ہونے کو کہا۔ اسی دن سے شہر کا ڈپٹی کمشنر نہ صرف مجھے اچھی طرح سے جاننے لگا ہے بلکہ میری عزّت بھی کرتا ہے۔"

ٹھگ کی آپ بیتی سُن کر بُڑھیا نے بڑی بے نیازی سے کہا۔ "بیٹا! تم تو بڑے بہادر نِکلے۔ مشکل کا سامنا بڑی ہمّت سے کیا۔ تمھاری ہمّت اور حوصلے کی داد جتنی بھی دی جائے کم ہے۔"

یہ سُن کر ٹھگوں نے سر پیٹ لیا۔ تیر نشانے پر نہ بیٹھتے دیکھ کر دونوں بڑے پریشان ہوئے۔ لیکن اپنی پریشانی کو چھپاتے ہوئے بولے۔ "نانی امّاں!

اب آپ بھی کوئی ایسی ہی آپ بیتی سُنائیے جو سچّی ہونے کے ساتھ ساتھ ذرا دلچسپ بھی ہو۔"

"سچ کا بول بالا، جھوٹے کا منہ کالا۔ زندگی میں کبھی جھوٹ نہیں بولا تو اب بڑھاپے میں جھوٹ بول کر اپنی عاقبت کیوں خراب کروں گی۔" بڑھیا نے کہا۔ "لیکن بچّوں اگر تم نے میری کہانی کو جھوٹ سمجھا تو میں بھی تم سے سو سو روپے وصول کرلوں گی۔"

اسی امید پر کہ بڑھیا کی کہانی سُننے کے بعد ایک بار پھر انھیں بڑھیا کو پھانسنے کا موقع مل جائے گا، ٹھگوں نے ایک زبان ہو کر کہا۔ "ہاں ہمیں منظور ہے۔ نانی اماں!"

"تو پھر سُنو۔" بڑھیا نے اپنی آپ بیتی سُنانی شروع کی۔

"میرا باپ ایک کسان تھا۔ جب میری شادی کی تو اس نے جہیز میں بیلوں کی ایک جوڑی بھی مجھے دی۔ بہت اچھی جوڑی تھی۔ دُور دُور کے گاؤں سے لوگ ان بیلوں کو دیکھنے آتے تھے۔ ایک دن کیا ہوا کہ باہر کھیتوں ہی میں کام کرتے کرتے وہ دونوں بیل ایک دوسرے سے بھڑ گئے۔ ایک نے دوسرے کے ماتھے پر ایسا سینگ مارا کہ خاصا گہرا زخم آگیا۔ بہت علاج کروایا۔ مگر زخم تھا کہ بھرنے میں نہ آتا تھا، نہ آیا۔ ایک دن نہ جانے کہاں سے ایک بنولا زخم میں جا گھسا۔ بہت کوشش کی مگر نہیں نکلا۔ کچھ ہی دنوں میں وہاں ایک پودا اُگ آیا۔ بڑھتے بڑھتے جب وہ خاصا بڑا ہو گیا تو اس میں ایسی عُمدہ کپاس کے ڈوڈے لگے کہ تمھیں کیا بتاؤں۔ ہم نے کپاس جمع کرنا شروع کر دی۔ اس طرح سے ہمارے پاس کافی کپاس جمع ہو گئی۔ اب تو اس انوکھے بیل کی چرچا اور بھی دُور تک ہونے لگی۔ اور روزانہ اس بیل کو دیکھنے والوں کا تانتا لگنے

لگا۔ ہم نے بیل کو اپنی حویلی میں باندھ دیا۔ اور اس عجوبے کو دیکھنے کے لیے بیل درشن چندہ کے طور پر چار آنے فی کس ٹکٹ لگا دیا۔ سچ پوچھو تو اس بیل کی بدولت ہمارے دن پھر گئے۔ بیل درشن چندے کے ذریعے جب ہمارے پاس اچھی خاصی رقم جمع ہو گئی تو ہم نے کئی عورتیں روئی بیلنے کے کام پر لگائیں ایک طرف دُھنیے رُوئی دُھن رہے تھے۔ تو دوسری طرف کئی عورتیں چرخوں پر سُوت کات رہی تھیں۔ اسی طرح کئی جولاہے ہمارے ہی سُوت کا کپڑا تیار کرنے پر مقرر کر دیے گئے۔ جنھوں نے بُن بُن کر کپڑوں کے انبار لگا دیے۔ ان کپڑوں میں کھیس خاص کر بہت اچھے بُنے تھے۔ ایک دن جب کپڑے کا حساب لگایا گیا تو پتہ چلا کہ دو کھیس چوری ہو گئے ہیں۔ بہت تلاش کیے گئے مگر آج تک ان کا پتہ نہ چل سکا تھا۔ بیٹا! خُدا جھوٹ نہ بلوائے تو اب پتہ چل گیا ہے کہ چوری ہونے والے یہی وہ کھیس ہیں جو تم دونوں نے اوڑھ رکھے ہیں۔ شرافت کا تقاضا یہی ہے کہ مہربانی کر کے یہ کھیس مجھے فوراً واپس کر دو۔" شرط ہارنے کے ڈر سے دونوں نے بغیر کسی حیل و حُجت کے اپنے اپنے کھیس بُڑھیا کے حوالے کر دیے۔

بُڑھیا نے دونوں کھیس سنبھالے اور کہانی کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "تو ہاں بیٹے! اسی کپاس سے ایک جولاہے نے ایسی مَلمَل بھی تیار کی جسے پگڑیاں بنانے کے لیے لوگ ہاتھوں ہاتھ خرید کر لے جانے لگے۔ لیکن دیکھا تو یہاں بھی مَلمَل کا ایک تھان چوری ہو گیا۔ بہت تلاش کیا گیا مگر اس کا بھی کچھ پتہ نہ لگا لیکن اب میں دیکھ رہی ہوں کہ یہ پگڑیاں جو تم دونوں نے باندھ رکھی ہیں، یقیناً مَلمَل کے اسی چوری ہو جانے والے تھان کی ہیں۔" پانسہ پلٹتے دیکھ کر ٹھگ بہت پچھتائے۔ کہ اب تو لینے کے دینے پڑ گئے ہیں۔ اگر وہ پگڑیاں بُڑھیا کے حوالے نہیں کرتے تو شرط کے مُطابق دونوں کو سو سو روپے دینے پڑیں گے

لہٰذا انھوں نے خیریت اِسی میں سمجھی کہ پگڑیاں بھی بُڑھیا کے حوالے کر دیں۔

اب وہ شہر کے نزدیک پہنچ گئے تھے۔ یہ سوچ کر کہ اگر بُڑھیا نے اپنی کہانی جاری رکھی تو کہیں ان کے کُرتے اور دھوتیاں بھی نہ اُتروالے۔ ایک ٹھگ نے بات پلٹتے ہوئے کہا کہ "نانی امّاں! آپ کی کہانی تو واقعی سچی اور دلچسپ معلوم ہوتی ہے۔ لیکن ہمیں بھوک بہت لگ رہی ہے۔ کھانے کے لیے کچھ لائی ہو تو ہمیں بھی دو۔"

بُڑھیا نے کہا۔ "بس اب تو شہر آیا ہی سمجھو بیٹا۔ اب مجھے اپنے زیور بیچنے ہیں۔ جب زیور بِک جائیں گے تو آرام سے کسی جگہ بیٹھ کر کھانا بھی کھائیں گے۔ ٹھگ دِل ہی دِل میں خوش ہوئے اور سوچا کہ اچھا بُڑھیا تم ذرا اپنے زیور بیچ تو لو، پھر کوئی داؤں چلائیں گے۔ آخر جائے گی کہاں ہم سے بچ کر۔"

کچھ ہی دیر میں وہ تینوں شہر پہنچ گئے۔ جب وہ سُنار کی دوکان کے قریب پہنچے تو بُڑھیا نے ٹھگوں کے سامنے اپنے زیور اُتارے اور بولی، بیٹا! یہ رہی سُنار کی دوکان۔ تم ذرا یہیں ٹھہرو۔ مَیں یہ زیور بیچ کر ابھی آتی ہوں۔ ٹھگ سُنار کی دوکان کے باہر بیٹھ گئے۔ اور بُڑھیا اندر چلی گئی۔ سُنار نے پوچھا۔ "کیا چاہیے اماں!"

"مَیں اپنے دو نوکروں کو بیچنا چاہتی ہوں۔ وہی دونوں جو سامنے بیٹھے دِکھائی دے رہے ہیں۔" بُڑھیا نے کہا۔ "اگر آپ کو ضرورت ہو تو . . . ."

"نوکروں کی تو ہمیں ضرورت بھی تھی۔ لیکن لیں گی کیا آپ ان دونوں

کا۔" سُنار نے پُوچھا۔

"صرف پانچ سو روپے۔" بُڑھیا نے جواب دیا۔

"پانچ سو روپے تو بہت زیادہ ہیں۔ کچھ کم کیجیے تو بات بن سکتی ہے۔" سُنار نے کہا۔

معاملہ چار سو روپے میں طے ہونے والا کہ بُڑھیا دِکھاوے کے لیے سوچ میں پڑ گئی۔ اور سُنار سے کہنے لگی۔ ذرا رُکیے۔ مَیں نوکروں سے بھی تو پُوچھ لوں کہ وہ دونوں الگ الگ جگہ پر بِکنا چاہتے ہیں یا دونوں کو یہیں بیچ دوں۔ یہ کہہ کر بُڑھیا نے ذرا اُونچی آواز سے پُوچھا۔ "ہاں بیٹو! ذرا یہ تو بتاؤ کہ ایک ایک کر کے بیچوں یا دونوں کو ایک ہی جگہ یہیں فروخت کر دوں۔"

ٹھگوں نے سمجھا کہ بُڑھیا زیوروں کے بارے میں پُوچھ رہی ہے۔ وہیں بیٹھے بیٹھے دونوں نے جواب دیا۔ "نانی اماں! دونوں کو ایک ہی جگہ یہیں پر بیچ دیجیے۔ الگ الگ جگہوں پر کیوں بیچیے گا۔ یہ سُن کر سُنار کو بھی تسلّی ہو گئی کہ سودا نوکروں کی رضامندی ہی سے طے ہو رہا ہے۔ اس نے خوشی خوشی چار سو روپے بُڑھیا کو تھما دیے۔ دونوں ٹھگوں کے دام کھرے کر کے بُڑھیا دوکان سے باہر نکلنے لگی تو ٹھگوں نے پھر کہا۔ "نانی اماں! بھوک تو پہلے ہی لگ رہی تھی۔ کھانے کے ساتھ اب تو مِٹھائی بھی کھائیں گے۔ جلدی سے ہمارا مُنھ میٹھا کرا دیجیے اب۔"

"گھبراؤ نہیں بیٹا! ابھی لاتی ہوں تمھارے کھانے کے لیے بھی۔ تم یہیں ٹھہرو۔" بُڑھیا جب جانے لگی تو ایک ٹھگ نے پیچھے سے پھر آواز دی۔ تھوڑی سی مِٹھائی ضرور لیتی آنا اماں۔

"ہاں ہاں! سب کچھ لاؤں گی۔ تم فکر مت کرو۔ یہی کہتے کہتے بُڑھیا آنکھوں

ے اوجھل ہو گئی۔ اور ٹھگ مٹھائی کی انتظار میں وہیں بیٹھے گپ ہانکتے رہے۔ سُنار نے جب دیکھا کہ کیسے نوکر ہیں۔ باہر بیٹھے باتیں کیے جا رہے ہیں تو سُنار نے انھیں اندر بُلا کر ڈانٹنا شروع کیا۔ "بدتمیز کہیں کے۔ پیسے کھرے کروا کے اس ماں کو تو چلتا کر دیا ہے۔ اب کام تمھارا باپ کرے گا۔ کام چور کہیں کے۔ اسی لیے گلا پھاڑ پھاڑ کر چلاّ رہے تھے کہ دونوں کو ایک ہی جگہ پر فروخت کر دیجیے۔ گپ ہانکنے کے لیے ہی ہی نا۔" چلو یہ کام کرو۔

تھوڑی دیر تو چوں چراں کیے بغیر سُنار کی ڈانٹ ڈپٹ سُنتے رہے۔ لیکن جب معاملہ سمجھ میں آیا تو بہت سٹپٹائے۔ زندگی میں غالباً یہ پہلا موقع تھا جب ان ٹھگوں نے بھی محسوس کیا کہ واقعی کبھی کبھی سیر کو سوا سیر بھی مل جاتا ہے۔

جیسے کو تیسا

پُرانے زمانے کی بات ہے کہ کسی گاؤں میں دو بھائی رہا کرتے تھے۔ باپ کا سایہ سر سے اُٹھ چکا تھا۔ ترکے میں باپ تھوڑی سی زمین چھوڑ گیا تھا۔ اسی پر دونوں بھائی مل کر کام کرتے اور بڑے آرام سے زندگی گزارتے تھے۔ البتہ کھانا پکانے میں انھیں کچھ دِقت کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ انھوں نے مشورہ کیا کہ ان میں سے کسی ایک کی شادی ہو جائے تو یہ مسئلہ بھی حل ہو جائے۔ چنانچہ بڑے بھائی نے شادی کر لی۔

بیوی نے آتے ہی پورے گھر کو اپنے قبضے میں کرنا شروع کر دیا۔ کھیتوں میں کام کرتے ہوئے بھی بھاوج کو دیور کی موجودگی ناگوار سی گزرتی تھی۔ رفتہ رفتہ اس نے میاں کے کان بھرنے شروع کیے۔ ایک دن بڑے بھائی نے چھوٹے بھائی سے کہا کہ کھیتوں کی دیکھ بھال کے لیے تو ہم دونوں میاں بیوی ہی کافی ہیں۔ تم چوں کہ چھوٹے ہو اور ابھی تمھارے کھانے پینے کے دِن ہیں۔ اس لیے تم کھاؤ پیئو اور عیش کرو۔ اور کھیتی باڑی کی کوئی فکر مت کرو۔

میاں بیوی کی اس فراخ دِلی کے پیچھے بھی ایک چال تھی۔ ان کی خواہش تھی کہ کسی طرح سے چھوٹا بھائی الگ ہو جائے۔ چنانچہ کافی سوچنے سمجھنے کے بعد

بڑے بھائی نے اپنے چھوٹے بھائی کی شادی بھی کر دی اور دونوں بھائی اپنی اپنی بیویوں کے ساتھ ایک ہی گھر میں رہتے رہے۔

کچھ دن تو آرام سے گزر گئے۔ ایک دن بڑا بھائی جب گھر آیا تو اچانک اپنے چھوٹے بھائی اور اس کی بیوی پر برس پڑا۔ "تم دن بھر گھر پر پڑے پڑے مفت کی روٹیاں توڑتے رہتے ہو۔ ہم سارا دن کام کرتے کرتے مر جاتے ہیں۔ تمھیں کام کی کوئی فکر ہی نہیں۔ کان کھول کر سُن لو۔ اگر یہی حال رہا تو تمھیں مانگنے پر بھیک بھی نہیں ملے گی۔ تم جیسے نکمّے آدمیوں کے لیے ہمارے گھر میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ جہاں جی چاہے چلے جاؤ۔"

یہ سن کر وہ دونوں بڑے پریشان ہوئے اور سوچنے لگے۔ "اب کیا کریں۔ دُنیا میں اس بھائی کے سوا اور تو کوئی بھی ہمارا اپنا نہیں ہے۔ اب جب کہ یہ بھی ٹھکرا رہا ہے تو ہم کس کے پاس جائیں۔" مرتا کیا نہ کرتا۔ آخر کار چھوٹے بھائی نے بھی ایک معمولی سا مکان کرائے پر لے لیا اور اپنی بیوی کے ساتھ اس میں رہنے لگا۔ وہ دن بھر محنت کر کے اپنا اور بیوی کا پیٹ پالتا تھا۔ اور محنت سے کبھی جی نہیں چُراتا تھا۔ پھر بھی چوں کہ وہ کوئی معقول رقم نہیں کما پاتا تھا، بیوی بھی اکثر اسے نکھٹّو ہونے کے طعنے دینے لگی۔ اس نے کہیں سُن رکھا تھا کہ گاؤں کی نسبت شہر میں کمائی زیادہ ہو جاتی ہے۔ چنانچہ بیوی کے روز روز کے طعنوں سے تنگ آ کر ایک دن اس نے فیصلہ کیا کہ وہ بھی شہر جا کر دِن رات محنت مزدوری کرے گا اور بہت سے پیسے کمائے گا اور پھر واپس اسی گاؤں میں آ کر خوش حال زندگی بسر کرے گا۔ اس طرح سے وہ مستقبل میں خوش حالی کے خواب دیکھنے لگا۔

خواب دیکھنے پر تو کسی کی کوئی پابندی نہیں ہے۔ آدمی جو چاہے، جس

کے بارے میں چاہے، خواب دیکھ سکتا ہے۔ اس کے لیے زماں و مکاں کی بھی کوئی قید نہیں ہوتی۔ خواب میں آدمی اس حسین دُنیا کی سیر بھی کر لیتا ہے۔ جو اس کے اندر کہیں چھُپی ہوئی ہوتی ہے۔ حقیقت میں نہ سہی خواب میں تو اس کی یہ تمنّا پوری ہو ہی جاتی ہے۔ مگر جب آنکھ کھُلتی ہے۔ تو سپنے ٹوٹ جاتے ہیں۔ اور ساتھ ہی آدمی بھی ٹوٹ کر بکھر جاتا ہے۔

سردی کا موسم تھا۔ سردیوں میں کام کا تو ویسے بھی مندا پڑ جاتا ہے۔ جسم کو چیرتی ہوئی ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں۔ چاروں طرف پڑی ہوئی دُھند کو دیکھ کر لگتا تھا کہ قریب کی کسی پہاڑی پر برف گری ہے۔ ایسے کڑاکے کی سردی میں وہ بے چارہ کام کی تلاش میں مارا مارا پھرتا تھا اور ایک میلی سی پھٹی ہوئی چادر اوڑھے سردی سے بچنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ کون جانتا تھا کہ اس چادر میں وہ والدین کا داغِ مفارقت، بھائی کی بے مروّتی، بیوی کے طعنے اور بے روزگاری اور تنگ دستی کی مُصیبت جیسے کتنے دُکھ درد سمیٹے ہوئے ہے۔ جہاں کہیں کام مِلنے کی توقع ہوتی۔ وہاں بھی اسے کام نہ مِلتا تو بے چارے کے خوش حالی کے سارے سپنے ٹوٹ کر بکھر جاتے۔ رفتہ رفتہ سال ختم ہو رہا تھا۔ مگر اس کی قسمت کا ستارہ ہنوز گردش میں تھا۔

سال کا آخری دن تھا۔ لوگ سال کے دیوتا کو الوداعی نذر و نیاز پیش کرنے اور ایک دوسرے کے ہاں دعوتیں دینے کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ مگر اس بے چارے کے گھر میں آج بھی کچھ نہ تھا۔ مجبور ہو کر وہ اپنے بڑے بھائی کے پاس گیا۔ اور اس سے دو سیر چاول اُدھار مانگے۔ بڑا

بھائی بڑی بے رُخی سے پیش آتے ہوئے بولا۔ "دُنیا میں شاید ہی ایسا کوئی بے وقوف ہوگا جس کے گھر میں سال کے آخری دن دیوتا کو نذرانہ پیش کرنے کے لیے چاول کا دانہ تک نہ ہو۔ سال بھر آخر کرتے کیا رہے ہو۔ سال میں ایک بار تو یہ دن آتا ہے۔ اس کے لیے بھی آدمی اگر کچھ بچا کر نہ رکھے تو کسی دوسرے کو اس کی فکر کیوں ہو۔ اور پھر تم شادی شُدہ ہو۔ اگر اپنا پیٹ بھی نہیں پال سکتے تو یہ قرض کب چُکاؤ گے۔ جاؤ کسی اور کا دروازہ کھٹکھٹاؤ۔ میرے پاس تمھارے لیے چاول نہیں ہیں۔"

چھوٹے بھائی کو اب کچھ سُجھائی نہیں دیتا تھا۔ مایوس ہو کر وہ ایک پہاڑی کی طرف چل پڑا۔ پہاڑی پر اسے لمبی اور سفید داڑھی والا ایک بُزرگ آدمی ملا جو جلانے کے لیے لکڑیاں کاٹ رہا تھا۔ اسے اس طرح پریشان گھومتے دیکھ کر اس بُزرگ نے اس کی پریشانی کا سبب پُوچھا۔ بُزرگ کا احترام کرتے ہوئے لڑکا بڑے ادب سے بولا۔ "بُزرگ بابا! آپ تو جانتے ہی ہیں کہ آج سال کا آخری دِن ہے۔ لیکن مجھ بد نصیب کے گھر میں سال کے دیوتا کی نذر و نیاز کے لیے بھی چاول کا ایک دانا تک نہیں ہے۔ میں سال کے دیوتا کا عقیدت مند ہوں۔ میں بھی اسے نذرانہ پیش کرنا چاہتا ہوں۔ مگر تنگ دستی اور غریبی کی حالت میں میرا کوئی پرسانِ حال نہیں۔ لہٰذا اسی پریشانی کی حالت میں ادھر پہاڑی کی طرف نکلا تھا کہ شاید . . . ."

لمبی سفید داڑھی والا یہی بُزرگ سال کا دیوتا تھا۔ لڑکے کی درد ناک باتیں سُن کر اسے اپنے عقیدت مند پر رحم آگیا۔ وہ اسے دِلاسا دیتے ہوئے بولا۔ "واقعی یہ بہت بُری بات ہے کہ مُصیبت اور ضرورت کے وقت بھی آدمی، آدمی کی مدد نہیں کرتا۔ تم گھبراؤ نہیں۔ دُنیا میں جس کا کوئی نہ ہو،

اس کا خدا ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی جو کے ستو کا ایک ڈبہ لڑکے کی طرف بڑھاتے ہوئے بزرگ نے کہا۔ "لو میں تمھیں یہ دیتا ہوں۔ یہ ستو تم سامنے والی پہاڑی کے پیچھے جنگل کے دیوتا کے مندر میں لے جاؤ۔ اس مندر کے پچھواڑے ایک بڑا سا غار ہے۔ تم اس غار کے اندر چلے جانا۔ اس غار میں کئی بونے رہتے ہیں۔ وہ ستو کھانے کے بہت شوقین ہیں۔ وہ تم سے ستو مانگیں گے۔ مگر تم انھیں آسانی سے یہ ستو مت دینا۔ بار بار اصرار کرتے ہوئے اس کے بدلے میں وہ تمھیں کچھ بھی دینے کو تیار ہو جائیں گے۔ وہیں ایک چھوٹی سی چکی پڑی ہوگی۔ جب ان کا اصرار حد سے بڑھ جائے تو تم ان سے وہ چکی لے کر ستو دے دینا۔"

ستو کا ڈبہ سنبھالتے ہوئے اس نے بزرگ کا شکریہ ادا کیا اور اس کے بتائے راستے سے اسی پہاڑی کی طرف روانہ ہو گیا۔ جنگل کے دیوتا کے مندر پر پہنچ کر وہ فوراً اس کی پچھلی طرف گیا۔ دیکھا تو واقعی وہاں ایک بہت بڑا غار تھا۔ وہ اس غار کے اندر چلا گیا۔ کیا دیکھتا ہے کہ بہت سے بونے بڑے خوشگوار موڈ میں شور مچاتے ہوئے ایک چھپّر پر چڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مگر چڑھ نہیں پاتے ہیں۔ وہ بار بار چڑھتے ہیں، پھسلتے ہیں اور گر جاتے ہیں۔ پھر کوشش کرتے ہیں، پھر گر جاتے ہیں۔ کچھ دیر تو وہ کھڑا یہ تماشہ دیکھتا رہا پھر ان کی مدد کے لیے آگے بڑھا اور باری باری سے اٹھا کر ان سب کو اس چھپّر پر پہنچا دیا۔ جہاں پہنچنا چاہتے تھے۔ اپنی منزلِ مقصود پر پہنچ کر بونے خوشی سے اچھلتے ہوئے اس کی تعریف کرنے لگے۔ "اوہ! تم کتنے عظیم ہو۔ واقعی تم بڑے بہادر اور طاقت ور ہو۔ ہم تمھاری اس مدد کے لیے بہت شکر گزار ہیں۔"

بونے تو سبھی اس کی تعریفوں کے پُل باندھنے میں مگن تھے۔ لیکن وہ ان کی توجہ ستّو کے ڈبّے کی طرف دِلانے کی کوشش کرنے لگا۔ پھر وہ سب ایک ساتھ اس کی منّت سماجت کرتے ہوئے بولے۔ "تمھارے پاس جو چیز ہے، مہربانی کرکے وہ ہمیں دے دو۔ اور اس کے بدلے میں جو چاہے لے لو۔ جو کچھ بھی مانگو گے، ہم دینے کو تیار ہیں۔" اس کے ساتھ ہی انھوں نے کچھ سونا لاکر اس کے سامنے رکھ دیا۔ اس نے للچائی ہوئی ایک نظر سونے پر ڈالی مگر فوراً اسے بُزرگ کی بات یاد آگئی اور بولا۔ "بھائیو! میں لالچی نہیں ہوں جو تمھارا سونا بٹور کر چلتا بنوں۔ مجھے تمھارا سونا نہیں چاہیے۔ تمھارا سونا، تمھیں مُبارک ہو۔ پھر بھی اگر تم یہ ستّو لیے بغیر نہیں رہ سکتے تو مجھے وہ چھوٹی سی چکّی، جو کونے میں پڑی ہے، دے دو۔" یہ سُن کر سارے بونے کچھ سوچنے لگے کہ یہ انمول چکّی تو دُنیا بھر میں اپنا ثانی نہیں رکھتی۔ پھر یہی ہمارا قیمتی سرمایہ بھی ہے۔ یہ ہم اسے کیسے دے سکتے ہیں۔ مگر ستّو کھانے کے لیے سب کا جی للچا رہا تھا۔ چنانچہ انھوں نے ستّو کا ڈبہ لے کر اس انمول چکّی کے دونوں پاٹ اسے دے دیے۔ اور خوشی خوشی ستّو کھانے لگے۔

چکّی کے یہ دونوں پاٹ خوب صورت اور چھوٹے چھوٹے سے تھے۔ اس نے یہ دونوں پاٹ اُٹھائے اور غار سے باہر نکل آیا۔ وہ جلدی جلدی قدم بڑھاتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ کچھ ہی دیر میں وہ وہیں پہنچ گیا جہاں اسے سفید لمبی داڑھی والا بُزرگ ملا تھا۔ وہ بُزرگ ابھی تک وہیں موجود تھا۔ اس کے پاس اس انمول چکّی کو دیکھ کر وہ بہت خوش ہوا اور بولا۔ "لو بیٹا! اب تمھاری مُصیبت کے دن ختم ہوگئے۔ یہ چکّی تمھارے زندگی کے تمام خواب حقیقت میں بدل دے گی۔ سُنو! اس چکّی کے پاٹوں کو دائیں طرف جُھکا کر اگر تم اپنی خواہش ظاہر کروگے

تو یہ چکّی تمھیں ہر وہ چیز فراہم کرے گی جو تم چاہو گے۔ اور جب تم انھیں بائیں طرف جھکا دو گے تو وہ چیز آنا بند ہو جائے گی۔ خدا کا نام لے کر اب تم اس چکّی کو لے جاؤ۔ خدا نے چاہا تو زندگی آرام سے بسر کرو گے۔"

لڑکے نے بزرگ کا شکریہ ادا کیا۔ اور اس انمول چکّی کے دونوں پاٹ اُٹھا کر خوشی خوشی گھر کی راہ لی۔ گھر پر بیوی اس کا انتظار کرتے کرتے تنگ آ چکی تھی۔ اسے دیکھتے ہی کڑک کر بولی "آ گئے ہو، آوارہ گردی کر کے۔ آج تہوار کا دن ہے۔ لوگ دیوتا کی نذر و نیاز کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔ اور تمھارا کچھ پتہ ہی نہیں چلتا۔ خود تو بھوکے سو رہو گے۔ سال کے دیوتا کی نیاز کا کیا ہوگا۔" پھر انگوچھے میں کچھ بندھا ہوا دیکھ کر قدرے اطمینان سے بولی۔ "کچھ لائے ہو پکانے کے لیے۔"

بیوی کو تسلّی دیتے ہوئے وہ کہنے لگا۔ "فکر مت کرو۔ تم تو خواہ مخواہ شور مچانے لگتی ہو۔ سب کچھ ابھی ہو جائے گا۔ ذرا اندر تو آؤ۔ اور وہ چٹائی بھی لیتے آنا۔"

بیوی چٹائی لے کر اندر آ گئی تو اس نے جلدی جلدی چٹائی بچھا کر اس پر انمول چکّی کے دونوں پاٹ رکھ دیے اور پھر انھیں تھوڑا سا دائیں طرف کر بولا "انمول چکّی کرشمہ دکھا اور مجھے کچھ چاول عطا فرما۔" یہ کہنے کی دیر تھی کہ چکّی چلنے لگی اور چٹائی پر چاول ہی چاول گرنا شروع ہو گئے۔ جب وہ تقریباً دس سیر ہو گئے تو اس نے چکّی کے پاٹوں کا جھکاؤ بائیں طرف کر دیا۔ دوسری بار اس نے چکّی کو پھر دائیں طرف جھکایا اور بولا۔ "انمول چکّی کرشمہ دکھا اور مجھے مٹھائی عطا فرما۔" اب کے طرح طرح کی مٹھائیاں چٹائی پر گرنے لگیں جب ان کی ضرورت کے مطابق مٹھائی گر چکی تو اس نے چکّی کے پاٹوں کا جھکاؤ بائیں طرف کر دیا۔ اسی طرح باری باری سے اس نے انمول چکّی سے مچھلی، پنیر، انڈے

جیسی سبھی ضروری چیزوں کی فرمائش کی اور وہ اسے سب فراہم ہوگئیں۔ انھوں نے خوشی خوشی سال کے دیوتا کو نذرانہ پیش کیا۔ سال کی آخری رات خود بھی خوب پیٹ بھر کر کھایا۔ اور خدا اور سال کے دیوتا کا شکر ادا کر کے سو گئے۔

اگلے دن نیا سال شروع ہونا تھا۔ میاں بیوی صبح سویرے اُٹھے۔ نہا دھو کر فرش پر چٹائی بچھائی اور اس پر چکّی کے دونوں پاٹوں کو رکھ کر دائیں طرف جھکایا اور فرمائش کی۔ "انمول چکّی کرشمہ دکھا اور مجھے ایک شان دار مکان عطا فرما۔" دوسرے ہی لمحے وہ دونوں ایک عالی شان مکان میں بیٹھے تھے۔ اور چکّی جُوں کی توں اُن کے سامنے تھی۔ پھر اس نے چکّی سے گھر کی دیگر ضروری چیزوں کی فرمائش کی۔ وہ سب بھی اسے مل گئیں۔ اس کے بعد اس نے چکّی سے بہت سی دولت اور سونے چاندی کی فرمائش کی۔ چکّی نے وہ سب بھی اسے فراہم کر دیا۔ اب وہ گاؤں کا سب سے بڑا امیر بن گیا۔

نئے سال کی خوشی میں انھوں نے کئی قسم کے کھانے پکائے اور اپنے تمام رشتے داروں اور دوست احباب کو بھی کھانے کی دعوت دی۔ اور ان سب کی خوب خاطر تواضع کی۔ سوائے کچھ خاص رشتے داروں کے، سب دوست احباب جب کھا پی کر چلے گئے تو اس نے سوچا کہ گاؤں کے باقی سب لوگوں کو بھی نئے سال کے تحفے دینے چاہئیں۔ چنانچہ وہ دوسرے کمرے میں گیا اور چکّی کو سامنے رکھ کر دائیں طرف جھکایا اور بولا۔ "انمول چکّی اپنا کرشمہ دکھا اور مجھے مٹھائی کے بہت سے ڈبّے عطا فرما۔" جب وہ یہ سب کچھ کر رہا تھا تو پردے کے پیچھے اس کا بڑا بھائی کھڑا چپکے چپکے سب کچھ دیکھتا رہا۔ اس

کے دیکھتے ہی دیکھتے چکی چلنے لگی اور مٹھائی کے ڈبوں کے انبار لگ گئے۔ اس سے پہلے وہ حیران تھا کہ راتوں رات اس کے پاس اتنی دولت کہاں سے آئی۔ اب جو انمول چکی کا کرشمہ دیکھا تو سب سمجھ میں آگیا۔ وہ بھی خوشی سے اُچھل پڑا اور دل ہی دل میں کچھ سوچنے لگا۔

رات کا کھانا کھا کر اور تو سب لوگ چلے گئے۔ لیکن اس کا بڑا بھائی بہانہ کرکے وہیں ٹھہر گیا۔ جب چھوٹا بھائی اور اس کی بیوی سو گئے تو وہ دبے پاؤں اُٹھا اور انمول چکی کے دونوں پاٹ اور مٹھائی کے کئی ڈبے چُرا کر چلتا بنا۔ اس نے سوچا کہ اگر وہ خشکی کے راستے سے کہیں جائے گا تو جلدی پکڑا جائے گا۔ لہٰذا وہ سیدھا سمندر کے کنارے پہنچا اور وہیں سے ایک کشتی پر سوار ہو گیا۔ تاکہ وہ اس گاؤں سے بہت دُور کسی ایسی جگہ چلا جائے جہاں وہ انمول چکی کے کرشموں کی بدولت عیش و آرام کی زندگی بسر کر سکے۔ اب وہ کشتی کو کھیتا چلا جا رہا تھا۔ اور جب بھی بھُوک محسوس ہوتی تھی۔ تو ڈبے کھول کر مٹھائی کھانا شروع کر دیتا تھا۔ صرف مٹھائی کھاتے کھاتے اس کا جی بھر گیا۔ کوئی بھی نمکین چیز تو وہ ساتھ لایا ہی نہیں تھا۔ اس لیے اس کی تسلی نہیں ہو رہی تھی۔ وہ نمکین چیز کھانے کے لیے بے تاب ہو رہا تھا۔ لیکن سمندر کے بیچوں بیچ نمکین چیز اسے کہاں سے ملتی۔ بے چینی کی حالت میں وہ کچھ سوچ بھی نہ پایا جلدی سے اس نے چکی کے دونوں پاٹوں کو دائیں طرف جھکایا اور فرمائش کی۔ "انمول چکی اپنا کرشمہ دکھا اور مجھے تھوڑا سا نمک عطا فرما۔" اس کا یہ کہنا تھا۔ کہ کشتی میں نمک گرنا شروع ہو گیا۔ نمک دیکھ کر وہ خوشی سے پھُولا نہ سمایا۔ مگر جب نمک گرنا بند ہونے میں نہ آیا تو وہ گھبرا گیا۔ چلتی چکی کے کرشمے کو بند کرنے کی ترکیب تو اسے معلوم نہ تھی۔ گھبراہٹ کی وجہ سے اس کی سمجھ میں بھی کچھ نہیں

آ رہا تھا۔ چاروں طرف پھیلا ہوا سمندر کا پانی تھا۔ اور ادھر نمک تھا کہ مُسلسل گرتا ہی جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ نمک کے بوجھ سے کشتی سمندر میں ڈوبنے لگی۔

دغا باز کا بیڑا تو غرق ہونا ہی تھا۔ وہ بیڑا اس کو بھی اپنے ساتھ لے ڈوبا۔ اور وہ سمندر کی گود میں جا کر سدا کی نیند سو گیا۔ انمول چکّی مسلسل اپنا کام کرتی رہی۔ کہتے ہیں کہ اس انمول چکّی کے دونوں پاٹ سمندر کی تہہ میں محفوظ ہیں۔ اور لگاتار اپنا کام کیے جا رہے ہیں۔ نہ کوئی سمندر کی تہہ میں جا کر انھیں بائیں طرف جُھکاتا ہے اور نہ وہ نمک بنانا بند کرتے ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اسی لیے سمندر کا پانی روز بروز نمکین سے نمکین تر ہوتا جا رہا ہے۔

حسد بُری بلا ہے

جیک اور ہنری دو ہم عمر لڑکے تھے۔ بچپن سے دونوں میں گہری دوستی تھی۔ پڑھتے تو دونوں ایک ہی اسکول میں تھے۔ لیکن پڑھنے سے زیادہ وہ شرارتوں میں لگے رہتے تھے۔ پڑھنے لکھنے میں انھیں ذرا بھی دلچسپی نہ تھی۔ اسکول سے آکر سارا وقت کھیل کود میں ضائع کر دیتے تھے۔ نہ اسکول کا کام کرتے تھے اور نہ گھر کے کام کو ہی ہاتھ لگاتے تھے۔ تنگ آکر دونوں کے گھر والوں نے ان کی پڑھائی کا سلسلہ ختم کر دیا۔

پڑھنے لکھنے کے چکّر سے بے فکر ہو کر اب وہ شُترِ بے مہار کی طرح گلیوں میں اور بھی زیادہ آوارہ گردی کرنے لگے۔ وقت کسی کا انتظار نہیں کرتا۔ اب وہ بڑے ہو چکے تھے۔ لیکن کام کاج کچھ نہیں کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ گھر والے بھی ان سے بیزار رہنے لگے تھے۔ رفتہ رفتہ جب انھیں اپنی غلطی کا احساس ہوا تو روزگار تلاش کرنے لگے۔ اسی گاؤں میں رہ کر کوئی چھوٹا کام کرتے انھیں شرم آتی تھی۔ دست کاری کوئی جانتے نہیں تھے۔ کہ انھیں اچھا کام مِلتا بھی تو کہاں سے۔ مایوس ہو کر دونوں نے فیصلہ کیا کہ کسی دوسرے ملک میں جا کر قسمت آزمائی کریں۔ ہو سکتا ہے چار پیسے کما لائیں۔ چُپکے چُپکے دونوں نے اپنا اپنا بوریا بستر باندھنا شروع کیا اور ایک دن اپنے فیصلے کے مطابق سفر پر چل نِکلے

اور ایک دُور دراز ملک میں جا پہنچے۔

پردیس میں جاکر جیک نے تو اپنی عادتوں کو ایک بڑی حد تک بدل لیا۔ اور دل لگاکر محنت مزدوری کرنے لگا۔ اپنے خون پسینے کی کمائی وہ بہت سوچ سمجھ کر خرچ کرتا تھا۔ اور آڑے وقت کے لیے کچھ نہ کچھ بچا بھی رکھتا تھا۔ اس طرح سے جیک کے پاس کچھ ہی دنوں میں اچھی خاصی رقم جمع ہو گئی۔ اس کے برعکس ہنری نے پردیس آکر بھی اپنی بُری عادتیں نہ چھوڑیں۔ وہ جو کچھ کماتا تھا عیاشوں اور بُرے لوگوں کی صُحبت میں بیٹھ کر خرچ کر دیتا تھا۔ فرصت کا سارا وقت وہ گھٹیا قسم کی تفریح اور عیاشی میں گزارنے لگا۔ جیک اسے جب بھی ملتا یہی سمجھاتا کہ بھائی! پردیس میں آکر تو جی لگاکر کام کرو۔ محنت سے انسان کا جسم تندرست، دماغ صاف اور جیب بھری رہتی ہے۔ اگر تم یونہی وقت ضائع کرتے رہو گے تو ایک دن وقت تمہیں ضرور برباد کر دے گا۔ ہنری ایسی باتیں سُنتے سُنتے جیک سے حسد کرنے لگا۔

دونوں دوست اپنے اپنے ڈھنگ سے اسی ملک میں رہتے رہے۔ مگر ہنری کو کئی کئی دن تک جیک سے ملنے کا موقع نہیں ملتا تھا۔ موقع ملتا بھی کیسے جو لوگ وقت کا صحیح استعمال نہیں کرتے وہی عام طور پر وقت کی تنگی کی شکایت کرتے ہیں۔ جیک اگر خود بھی اس سے ملنے جاتا، تو وہ وقت نہ مل سکنے کا بہانہ کرکے ٹال دیتا۔ دن اسی طرح گزرتے گئے۔ جب تین سال کا عرصہ گزر گیا تو ایک دن جیک کو گھر کی یاد ستانے لگی۔ اس نے سوچا کہ اب تو میرے پاس کافی پیسے جمع ہو گئے ہیں۔ اب مجھے اپنے وطن لوٹ جانا چاہیے۔ گھر کے سبھی لوگ مجھ سے مل کر کتنا خوش ہوں گے۔ یہی سوچ کر ایک دن وہ ہنری کے پاس گیا اور اپنے گھر جانے کا اِرادہ ظاہر کیا۔ پردیس میں یہ پہلا موقع تھا کہ ہنری کو بھی اپنے گھر والوں کی یاد آئی۔ اور وہ ایک ٹھنڈی سانس بھر کر بولا۔ "دوست! گھر جانے

کو تو میرا بھی جی چاہتا ہے۔ لیکن کیا کروں۔ میرے پاس تو اپنے پہننے تک کے کپڑے نہیں ہیں۔ گھر جا کر کیا منہ دکھاؤں گا۔"

یہ سن کر جیک کے دوستی کے جذبے نے جوش مارا۔ ہنری کو حوصلہ دیتے ہوئے وہ بولا "فکر مت کرو جیک! جانے کے لیے تم صرف ہاں کر دو۔ باقی سب انتظام میں خود کر لوں گا۔" ہنری خوش ہو گیا اور بولا "تو پھر ضرور چلوں گا۔" جیک نے اپنے لیے کچھ خریدنے سے پہلے ہنری کے لیے ضروری کپڑے اور سامان خریدا۔ پھر اپنے ماں باپ، بھائی، بہنوں کے لیے کپڑے اور زیور وغیرہ بنوائے۔ اور چلنے کی تیاری مکمل کر لی۔ چنانچہ جس طرح وہ اکٹھے آئے تھے، اسی طرح ایک ساتھ مل کر اپنے وطن کے لیے روانہ ہو گئے۔

کہتے ہیں آنکھ اچھائی کو کبھی نہیں دیکھ سکتی۔ ہنری بھی دل میں سوچتا جا رہا تھا کہ جیک کے پاس تو کافی روپیہ ہے۔ گھر جا کر خود کھائے گا اور گھر والوں کو بھی کھلائے گا۔ اور خوب آرام سے رہے گا۔ لیکن میں نے پردیس میں عیش کر کے غلطی کی۔ گھر جا کر جب میں اس کی طرح آرام سے نہیں رہ سکوں گا تو لوگ مجھے برا بھلا کہیں گے تب میں کیا جواب دوں گا۔ یہی سوچتے سوچتے اس کے دل و دماغ پر حسد بری طرح غالب آ گیا۔

حاسد کی نیت بدلتے دیر نہیں لگتی۔ ہنری کی نیت میں بھی اچانک فتور پیدا ہوا۔ جب وہ ایک گھنا جنگل پار کر رہے تھے تو ہنری ایک بہت بڑا گناہ کرنے پر تُل گیا۔ موقع پا کر اس نے جیک پر حملہ کر دیا۔ اور اس کا کام تمام کر کے اس کی ساری پونجی سمیٹی اور اکیلے گھر کی طرف چل دیا۔ جب وہ اپنے گاؤں میں پہنچا تو وہ بالکل بدل چکا تھا۔ وہ کسی سے سیدھے منہ بات نہیں کرتا تھا۔ لوگ اس سے جیک کے بارے میں پوچھنے آتے وہ بڑی بے پرواہی سے یہ کہہ کر ٹال دیتا کہ وہ

بہت بے کار آدمی ہے۔ پردیس پہنچتے ہی بالکل بدل گیا تھا اب وہ اس گاؤں والا جیک نہیں رہا۔ بُری صحبتوں نے اُسے کہیں کا نہیں چھوڑا۔ جتنا کماتا ہے اس سے کہیں زیادہ خرچ کر ڈالتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب وہ بال بال قرضے میں جکڑا ہوا ہے۔ مجھ سے تو بات بھی نہیں کرتا تھا۔ گھر لوٹنے کے لیے اس کے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں۔ اسی لیے تو میرے ساتھ نہیں آیا۔ لوگ اس کی باتیں سُن کر بہت مایوس ہوتے اور چُپ رہ جاتے۔

ہنری اب اپنے گاؤں میں بھی خوب عیش کی زندگی بسر کرنے لگا۔ کئی مُفت خورے اس کے دوست بن گئے۔ وہ دن رات شراب پیتے، جُوا کھیلتے اور گل چھرّے اڑاتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہنری کے باپ کی ساری کمائی کچھ ہی عرصے میں ٹھکانے لگ گئی۔ اور ایک بار پھر وہ پہلے کی طرح پیسے پیسے کا محتاج ہو کر آوارہ گردی کرنے لگا۔ ایک دن اس کے جی میں آئی کہ یہاں بھوکا مرنے کی بجائے کیوں نہ پھر اسی دیس میں چلا جائے۔ یہ خیال آتے ہی وہ اپنا گاؤں چھوڑ، پھر اسی مُلک کی طرف چل دیا۔

مسافتیں طے کرتا ہوا جب وہ جنگل کے ٹھیک اسی مقام پر پہنچا جہاں اس نے جیک کو قتل کیا تھا تو اسے ایک جانی پہچانی آواز سُنائی دی، جو ہنری، ہنری کہہ کر اسے پُکار رہی تھی۔ وہ چلتے چلتے رُک گیا۔ اور حیران پریشان اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ مگر جب اسے کوئی بھی نظر نہ آیا تو سوچا کہ شاید یہ اس کا وہم ہے جو راستہ سُنسان ہونے کی وجہ سے اس کے دِل میں پیدا ہوا ہے۔ دل کڑا کر کے وہ پھر چلنے لگا۔ قدم آگے بڑھایا ہی تھا کہ پھر وہی آواز سُنائی دی "ہنری، او ہنری" وہ پھر رُک گیا۔ سوچنے لگا یہاں ضرور کوئی چھلاوہ ہو گا۔ وہ کان لگا کر غور سے سُننے لگا۔ تھوڑی ہی دیر میں اسے پتہ چل گیا کہ آواز ایک جھاڑی

یلیں سے آرہی ہے۔ وہ اسی جھاڑی کی طرف گیا اور اس کے گرد چکر لگا کر دیکھنے لگا کہ وہاں اُسے کون پکار رہا ہے۔ کچھ بھی تو دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ٹہنیوں کو ذرا پرے ہٹا کر دیکھا تو اچانک اس کی نظر ایک انسانی ڈھانچے پر پڑی جو اس کی طرف دیکھ دیکھ کر ہنس رہا تھی۔

ہنری یہ دیکھ کر پہلے تو بہت گھبرایا۔ پھر حوصلہ کر کے آگے بڑھا اور اس ڈھانچے سے پوچھنے لگا کہ "تم کون ہو اور میری طرف دیکھ کر کیوں ہنس رہے ہو؟" ڈھانچہ یہ سُن کر اور بھی زور زور سے ہنسنے لگا اور بولا۔ "میرے دوست ہنری! پہچانا نہیں مجھے؟ کیا تم اتنی جلدی بھول گئے ہو۔ میں وہی جیک تو ہوں تمہارا دوست جسے تم یہیں چھوڑ کر خود اپنے گھر چلے گئے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ کبھی نہ کبھی تم سے پھر ملاقات ضرور ہوگی۔ آخر آج وہ دن آہی گیا جس کا مجھے انتظار تھا۔ تم سے مل کر مجھے بہت خوشی ہوئی ہے۔ سچ پوچھو تو آج میری تمنا پوری ہوگئی ہے۔ کہو! گھر میں سب ٹھیک تو ہیں۔

یہ اَن ہونی سی باتیں سُن کر ہنری کے اوسان خطا ہوتے جا رہے تھے۔ گھبرا کر وہ وہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا کہ ڈھانچے نے مضبوطی سے اس کا دامن پکڑ لیا۔ اور پوچھنے لگا۔ "بولتے کیوں نہیں۔ بتاؤ مجھے یہاں چھوڑ کر تم کہاں گئے تھے۔ اور اس وقت تم کہاں جانا چاہتے ہو؟"

ہنری کے پاس سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ صاف صاف بتا دے، چنانچہ وہ ڈرتے ڈرتے کہنے لگا۔ "دوست! میں تمہارے ساتھ بے وفائی کر کے گاؤں چلا گیا تھا۔ لیکن میرے باپ کی کمائی جلد ہی ختم ہوگئی۔ اور میں پھر بھوکا مرنے لگا۔ کہیں کام کی تلاش میں نکلا ہوں۔ مہربانی کر کے

مجھے جانے دو۔"

"اگر تم واقعی سچ کہہ رہے ہو تو تم نہرے کُتے کی دم ہو جو برسوں نلکی میں رہنے پر بھی سیدھی نہیں ہوتی۔ خود مُصیبت میں گرفتار رہتے ہو اور دوسروں کے لیے بھی مُصیبتیں کھڑی کرتے رہتے ہو۔ مَیں نے جیتے جی تمھاری مدد کی لیکن تم نہیں سنبھل سکے۔ اب مجھے تمھاری حالت پر رحم آتا ہے۔ تم مجھے اپنے ساتھ لے چلو۔ مَیں پھر تمھاری مدد کروں گا۔" ڈھانچے نے کہا۔

ہنری دل ہی دل میں سوچنے لگا۔ کہ "ہڈیوں کا یہ ڈھانچہ میری کیا مدد کر سکتا ہے۔ ایسا نہ ہو مجھے کسی مُصیبت میں ڈال دے۔ لیکن اس سے پیچھا بھی کیسے چھُڑایا جائے۔" وہ ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ ڈھانچے نے کہا۔ "گھبراؤ نہیں ہنری۔ مَیں تمھیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔" آج بھی مَیں تمھیں اپنا دوست ہی سمجھتا ہوں۔ جانتے ہو مَیں کتنا اچھا ڈانس کرتا ہوں۔ آج بھی میرے اس فن میں کوئی فرق نہیں آیا۔ تمھاری غیر موجودگی میں بھی مَیں ہر روز رقص کا ریاض کرتا رہا ہوں۔ اب تو میرے انگوں میں اور بھی لوچ آگیا ہے۔ یقین نہ ہو تو ابھی ناچ کر دکھاتا ہوں۔ "یہ کہتے ہوئے ڈھانچہ دھیرے دھیرے جھاڑی سے نکلا اور ڈانس کرنے لگا۔ وہ بڑی پھُرتی سے ہاتھ پاؤں کو ہلا ہلا کر دلِ کش ناچ، ناچ رہا تھا۔ اس نے نئے نئے طرز کے ڈانس پیش کیے۔ ہنری بُت بنا اس کا ڈانس دیکھتا رہا۔ پھر ناچنا بند کر کے ڈھانچے نے کہا:"

"ہنری! تم ایک کام کرو۔ اس صندوقچے میں بند کر کے تم مجھے اپنے

ساتھ لے چلو۔ اب نہ مجھے کھانے کی ضرورت ہے نہ پینے کی، نہ کپڑے کی، نہ دولت کی۔ میں تمھارے لیے دولت اکٹھی کروں گا۔ چند دنوں میں دولت کے ایسے انبار لگا دوں گا کہ تم حیران رہ جاؤ گے۔ اگر تم میرے ڈانس کے ساتھ کوئی گانا گا سکو یا پھر کوئی اچھی سی دُھن ہی بجا سکو تو یہ سونے پر سہاگے کا کام کرے گی۔ خُدا قسم ایسا ڈانس کیا کروں گا کہ لوگ دنگ رہ جائیں گے۔ اور چند دنوں میں ہی تم شہر کے امیر ترین شخص بن جاؤ گے۔ ڈھانچے نے کہا۔

ہنری کو ڈھانچے کی باتوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ لیکن اس کا ڈانس دیکھنے کے بعد اس نے سوچا کہ یہ تو واقعی دولت کمانے کا بہترین ذریعہ ہوگا۔ اس نے ڈھانچے کو اپنے صندوقچے میں بند کر لیا اور صندوقچہ اُٹھا کر اپنے راستے جانے لگا۔ پردیس پہنچ کر ہنری نے ڈھانچے کی تجویز پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ سب سے پہلے اس نے ایک ایسا ساز خریدا جس پر وہ مختلف دُھنیں بجا سکتا تھا۔ پھر اس نے اپنے گھر ہی پر ساز کی دُھنوں پر ڈھانچے کو رقص کی مشق کرائی۔ اب وہ اپنا صندوقچہ اور ساز اُٹھائے گاؤں گاؤں گھوم کر ساز کی دُھن پر ڈھانچے کا ڈانس دِکھاتا تھا۔ لوگ اس انسانی ڈھانچے کا عجیب و غریب کمال دیکھ کر بہت خوش ہوتے اور جی کھول کر پیسے دیتے۔

رفتہ رفتہ ہنری اور اس کے ڈھانچے کے ڈانس کی شہرت دُور دُور تک پھیل گئی۔ یہاں تک کہ ملک کے بادشاہ کو بھی پتہ چل گیا کہ انسانی ہڈیوں کے ڈھانچے کو اپنے ساز کی دُھن پر ناچ نچانے والا ایک جادُوگر اس کے مُلک میں آیا ہے۔ اس نے اسی وقت ایک خادم بھیج کر ہنری کو طلب کیا۔ بادشاہ

کا پیغام پاکر ہنری بہت خوش ہوا۔ اُسے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے اس کی قسمت کا ستارہ بس چمکنے ہی والا ہے۔ جب وہ بادشاہ کو اپنا کمال دکھائے گا تو وہ خوش ہوکر اسے دولت سے مالا مال کر دے گا۔ وہ اپنا صندوقچہ اور ساز اُٹھاکر شاہی خادم کے ساتھ ہولیا۔

ہنری جب بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو بادشاہ نے کہا۔ "اے جادوگر! سُنا ہے تمہارے کمال نے مُلک بھر میں دُھوم مچا رکھی ہے۔ ذرا ہمیں بھی تو اپنے ڈھانچے کے کرتب دکھاؤ۔" بادشاہ کا حکم پاتے ہی پہلے تو ہنری تعظیم کے لیے جُھکا۔ پھر صندوقچے سے ہڈیوں کا ڈھانچہ نکال کر زمین پر کھڑا کیا۔ اور ساز اُٹھاکر ایک دل کش دُھن بجانے لگا۔ ڈھانچہ اپنی جگہ سے ہلا تک نہیں۔ ہنری نے اس سے زیادہ دل کش دُھن بجائی۔ ڈھانچے میں پھر بھی کوئی حرکت پیدا نہ ہوئی۔ پھر وہ اپنے ساز ایک کے بعد ایک دُھنیں بجاتا رہا۔ لیکن ڈھانچہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ ہنری کو غُصّہ آگیا۔ اور وہ چھڑی اُٹھاکر ڈھانچے کو پیٹنے لگا۔ جیسے ہی جیک کی ہڈیوں پر چھڑی کی چوٹ پڑی ڈھانچہ کھسک کر بادشاہ کے قریب جا کھڑا ہوا۔ اور اپنے استخوانی ہاتھ جوڑ کر عرض کیا "حضور یہ حاسد ہنری بچپن ہی سے مجھے اُلٹے سیدھے ناچ نچاتا رہا ہے۔ موت کے بعد بھی اگر میں اس کے اشاروں پر ناچتا رہا ہوں تو اس کا صرف ایک ہی مقصد تھا۔ کہ کسی نہ کسی طرح مجھے آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کا شرف حاصل ہو جائے۔ یہ کہتے ہوئے ڈھانچہ بادشاہ کی تعظیم کے لیے جُھکا۔ اور پھر اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "آج میری دلی تمنّا پوری ہو گئی۔ مجھے امید ہے آپ میری دردناک داستان سُن کر ضرور انصاف فرمائیں گے۔"

اس کے بعد جیک کے ڈھانچے نے اوّل سے آخر تک اپنی ساری سرگزشت

کہہ سُنائی۔ بادشاہ بڑے غور سے سُنتا رہا۔ جب اس نے سُنا کہ جیک بے چارہ کس طرح مکار ہنری کے ساتھ شروع سے نیکی کرتا رہا اور اس کی نیکی کے بدلے میں ہنری نے نہ صرف اس کی ساری کمائی لُوٹ لی بلکہ اس بے چارے کی جان تک بھی لے لی تو بادشاہ سوچنے لگا کہ واقعی حسد انسان کو لے ڈوبتا ہے۔ چیزیں سمندر میں ڈوبنے کے بعد ایک خاص گہرائی سے نیچے نہیں جا سکتیں لیکن حسد کے سمندر کی گہرائی کی کوئی حد نہیں۔ حسد کے سمندر میں گر کر انسان ڈوبتا ہی چلا جاتا ہے۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ اس شخص کو فوراً گرفتار کر لیا جائے۔ اور اس پر قتل کا مقدمہ چلایا جائے۔

حکم کی تعمیل کی گئی۔ مقدمہ چلا تو پہلی ہی پیشی میں ہنری نے اپنے جُرم کا اقبال کر لیا۔ ایک بے گناہ کے قتل کے جُرم میں حاسد ہنری کو پھانسی کے تختے پر لٹکا دیا گیا۔

شیرے کی شرارت

بھولُو بچپن ہی سے میٹھی چیزیں کھانے کا بہت شوقین تھا۔ بڑے ہوکر بھی اس کا یہ شوق برابر بنا رہا۔ ایک بار جب اس کی ماں نے کہا بیٹا! سسرال جاکر اپنی بیوی کو لے آؤ، تو اس نے فوراً جواب دیا۔ "نہیں ماں! یہ کام تم خود ہی کرو۔ میری سسرال جس گاؤں میں ہے وہ بہت دُور ہے۔ اتنا لمبا راستہ طے کرتے کرتے مجھے بھوک لگ جاتی ہے۔ ماں، بیٹے کا رمز پہچانتی تھی۔ کہنے لگی۔ "نہیں بیٹا! یہ کام تمھارے ہی کرنے کا ہے۔ تمھاری بھوک کا علاج میں کیے دیتی ہوں۔ ایسی میٹھی چیز بنا کر دوں گی کہ گھر سے کھاتے ہوئے جاؤ گے تو بھی سسرال پہنچنے تک ختم ہونے میں نہیں آئے گی۔ اور راستہ بھی بلا تکان کٹ جائے گا۔" یہ کہہ کر ماں نے بیٹے کے لیے میٹھا شیرہ تیار کیا۔ اور اسے چینی مٹّی کے ایک برتن میں ڈال کر بھولُو کو دیتے ہوئے کہا۔ "دیکھو ایسی مزے دار چیز بنا کر دی ہے کہ انگلیوں سے چاٹتے جاؤ اور چلتے جاؤ۔ تمھیں پتہ بھی نہیں چلے گا کہ سفر کب ختم ہوگیا۔ اور تم سسرال پہنچ چکے ہوگے۔ لیکن خیال رکھنا کہ سسرال پہنچنے سے پہلے یہ سارا شیرہ ختم ضرور کر دینا ورنہ وہاں کے لوگ تمھارا مذاق اڑائیں گے۔"

بھولُو نے کہا۔ "تم فکر مت کرو ماں! میں یہ نوبت نہیں آنے دوں گا۔" یہ

کہہ کر وہ فوراً تیار ہو گیا۔ چلنے سے پہلے ایک اُنگلی شیرے میں ڈبوئی اور چاٹتے ہوئے خوشی سے اُچھل پڑا۔ "واہ کتنا مزے دار ہے یہ"۔ یہ کہتے ہوئے اس نے شیرے کا برتن اور تھیلا اٹھایا اور چلتا بنا۔ وہ انگلیوں سے شیرہ چاٹتا جاتا تھا اور تیز تیز قدموں سے چلتا بھی جاتا تھا۔ شیشم کے ایک پیڑ کے پاس پہنچ کر وہ چونک گیا۔ "اوہ میں تو سسرال پہنچ گیا ہوں۔ لیکن یہ شیرہ تو ابھی ختم ہی نہیں ہوا۔ واقعی ماں بہت عقل مند ہے۔ چیز ایسی بنا کر دیتی ہے، جو ختم ہونے کا نام نہیں لیتی۔ مگر مجھے تو اس کو سسرال پہنچنے سے پہلے ہی ختم کرنا تھا۔ وہ رُک گیا اور تیزی سے شیرہ چاٹنے لگا۔ لیکن ابھی کافی شیرہ باقی تھا۔ وہ وہیں بیٹھ گیا۔ اور پورا ہاتھ برتن میں ڈال کر شیرہ چاٹنے لگا۔ اُف یہ کم بخت تو اب بھی ختم ہونے میں نہیں آتا۔ اور رات ہوتی جا رہی ہے۔ "نہیں! نہیں! میں اسے ختم کر کے ہی دم لوں گا۔" اس نے فیصلہ کر لیا۔

دوسرے ہی لمحے وہ ڈوبتے ہوئے سورج کی طرف دیکھ کر بولا۔ "نہیں! اتنے سارے شیرے کو ختم کرنے کے لیے ایک ہاتھ سے کام نہیں چلے گا۔ اب میں اسے دونوں ہاتھوں سے چٹ کر جاؤں گا۔ یہ سوچ کر اس نے برتن کو زمین پر رکھا اور باری باری سے ڈالنے کی بجائے ذرا زور لگا کر دونوں ہاتھ ایک ساتھ برتن کے اندر ڈال دیے۔ اب جب ہاتھ نکال کر شیرہ چاٹنا چاہا تو برتن بھی ساتھ ہی چلا آ رہا تھا۔ ارے یہ کیا؟۔ اس نے برتن سے ہاتھ نکالنے کی بھرپور کوشش کی۔ مگر برتن تھا کہ گوند کی طرح چپک چکا تھا اور ہاتھوں سے علاحدہ ہونے کا نام نہ لیتا تھا۔ "ہائے! اب میں کیا کروں"۔ وہ پریشان ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا کہ کہیں کوئی اسے دیکھ تو نہیں رہا ہے۔

تھوڑی دوری پر اسے ایک آدمی آتا دکھائی دیا۔ کہنیوں کی مدد سے وہ جلدی جلدی ہاتھوں سمیت اپنے پورے جسم کو چادر سے ڈھانپنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس نے پھر اسی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھا تو وہ شخص اسی کی طرف آ رہا تھا۔ "اُف! اب میں کیا کروں۔ شاید اس نے مجھے اس حالت میں دیکھ لیا ہے۔ لیکن یہ ہو کون سکتا ہے۔ اور میری ہی طرف کیوں چلا آ رہا ہے"۔ جب وہ ذرا اور قریب آیا تو بھولُو سوچنے لگا کہ ہو نہ ہو یہ تو میرا سسر معلوم ہوتا ہے۔ سورج کی الوداعی کرنوں سے چمکتی ہوئی وہی صاف گنجی کھوپڑی، وہی موٹی پکوڑے جیسی ناک، وہی گینڈے کی سی موٹی گردن، وہی باہر کو نکلے ہوئے پیلے پیلے دانت، خرگوش کی دم کی طرح گچھے دار مونچھیں، بکرے کی سی ڈاڑھی اور پاؤں میں وہی شری رام چندر جی کے زمانے کی کھڑاؤں۔ یہی سب تو میرے سسر کے بھی ٹریڈ مارک ہیں۔ وہ حیران پریشان کھڑا سوچ ہی رہا تھا کہ اب کیا ہوگا۔ اتنے میں بوڑھا اور بھی اس کے پاس پہنچ گیا اور اس کے خیالوں کا تسلسل توڑتے ہوئے بولا۔ "بیٹا! آ گیا تو یہاں کھڑا کیا کر رہا ہے۔ گھر چل نا۔"

بھولُو چونک گیا۔ بوڑھے سسر کے پیر چھُونے کے لیے جھکنا چاہتا تھا کہ ادھ جھُکا ہی رہ گیا۔ سوچا، کہیں ایسا نہ ہو کہ بوڑھے سسر کو پتہ چل جائے کہ اس کے ہاتھ برتن میں پھنسے ہوئے ہیں۔ اس کی چادر بھی کندھوں سے کھسکنے لگی تھی، اپنی کمزوری کو چھپاتے ہوئے بڑے ادب سے بولا۔ "پتا جی! آج مجھے کوئی سواری نہیں مل سکی، پیدل ہی چل کر آ رہا ہوں۔ ہاتھ پیر بُری طرح تھک چکے ہیں۔ آپ ذرا میری چادر کو اچھی طرح سے میرے کندھوں پر ڈال دیں۔"

"ہاں بیٹا! یہ تو میں تیرے چہرے ہی سے بھانپ گیا تھا کہ تو بہت

تھکا ہوا ہے۔ لاؤ میں تجھے اچھی طرح سے چادر اوڑھادوں۔" اور بھولو کی چادر ٹھیک کرتے ہوئے بوڑھے سسر نے کہا۔ "آ! اب گھر چلیں۔"

بھولو چپ چاپ اس کے ساتھ چل پڑا۔ دل ہی دل میں وہ اپنی حرکتوں اور حماقتوں پر پشیمان ہو رہا تھا۔ اتنے میں سسر نے اس کے گھر کا حال پوچھنا شروع کیا۔ وہ بادل نخواستہ بوڑھے کے سوالوں کا جواب دیتا گیا۔ سسر نے سوچا کہ آج چوں کہ یہ بہت تھکا ہوا ہے، اسی لیے باتیں کرنے کو اس کا جی نہیں چاہتا۔ وہ بھی چپ ہو گیا۔ لیکن تھوڑی دیر بعد پھر بولا۔ "بھولو بیٹا! آج تو پہلے کی طرح ہاتھ ہلا ہلا کر نہیں چل رہا۔"

بھولو کھسیانا سا ہو کر بولا۔ "بتایا تو ہے کہ بہت تھک گیا ہوں پھر ہاتھ ہلا ہلا کر کیسے چلوں۔"

ناراض نہ ہو بیٹا! میں تو یوں ہی پوچھ رہا تھا۔ بوڑھے نے کہا۔ چلتے چلتے بوڑھا ایک کچے مکان پر جا کر رک گیا۔ دروازے کے کواڑ بند تھے لیکن چٹخنی نہیں لگی ہوئی تھی۔ بوڑھے نے کواڑ کھولے اور بھولو کو اندر آنے کے لیے کہا۔ پھر ایک چارپائی پر بستر بچھایا اور بھولو کو چارپائی پر بٹھایا۔ اور پکارنے لگا۔ "سندری کی ماں! ارے او سندری کی ماں!"

رسوئی سے آواز آئی۔ "اے ہائے! کبھی تو آ کر چپ سے بیٹھ جایا کرو۔ آتے ہی گلا پھاڑنے لگ جاتے ہیں۔" یہ کہتے ہوئے ایک بڑھیا بڑبڑاتی ہوئی رسوئی سے نکل کر کمرے کی طرف آئی۔ بوڑھے نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اری نیک بخت ذرا دیکھ تو سہی! کون آیا ہے؟"

بھولو کی ساس کا لہجہ ایک دم بدل گیا، اور اس نے مسکراتے ہوئے بھولو کو پیار کیا۔ پھر پوچھنے لگی۔ "بیٹا! کب آئے تم۔ تمھاری اماں اور باقی

سب کیسے ہیں۔" بھولو بے چارہ خاموش بیٹھا رہا۔ وہ اپنے ہی خیالوں میں غرق تھا۔ اس کی بجائے بوڑھے نے جواب دیا۔ "ابھی تو آیا ہے۔ پہلے کچھ سیوا تو کرو اس کی۔ تب بولے گا۔ تھکا ہوا ہے بے چارہ۔"

"اچھا! تو میں ابھی چائے بنا کر لاتی ہوں۔" کہتے کہتے بڑھیا کمرے سے باہر نکل کر رسوئی کی طرف چلی گئی۔ بھولو نے کہا۔ "نہیں! چائے کی ضرورت نہیں۔ تھوڑی دیر رک کر بنانا۔"

"تو بھوک لگ رہی ہوگی بیٹا!" بوڑھے نے پیار سے پوچھا۔

"نہیں مجھے ابھی بھوک بھی نہیں ہے۔" بھولو بے چارے کو تو اپنے ہاتھوں کی فکر تھی۔ جب تک ہاتھ برتن کی قید سے آزاد نہیں ہو جاتے بھوک پیاس اس کے پاس کیسے بھٹک سکتی تھی۔ چارپائی پر بیٹھے بیٹھے وہ سوچ رہا تھا۔ "ہائے رام! کس مصیبت میں پھنس گیا۔ نہ ماں مجھے اتنا زیادہ شیرہ بنا کر دیتی، نہ ہاتھ برتن میں پھنستے۔ نہیں نہیں! ماں پر تو میں خواہ مخواہ الزام لگا رہا ہوں۔ احمق تو میں خود ہوں، جس نے یہ حماقت کی۔ ماں نے تھوڑے ہی کہا تھا کہ دونوں ہاتھ برتن میں پھنسا لینا۔ نہ میں بیوی کو لینے آتا، نہ اس مصیبت میں گرفتار ہوتا۔ اب تو بھوکے پیاسے ہی رہنا پڑے گا۔ بھگتو بیٹا بھولو، اپنے کیے کی سزا۔"

بیٹھے بیٹھے اسے خیال آیا۔ "کیوں نہ یہ سب کچھ اپنی بیوی سندری کو بتا دوں۔ وہ مجھ سے زیادہ عقل مند ہے۔ شاید کوئی ترکیب بتا دے جس سے اس مصیبت سے چھٹکارا مل جائے۔ ورنہ میں کہیں کا نہ رہوں گا۔ بڑی بدنامی ہوگی۔ پھر سوچا "ہو سکتا ہے سسر کو میری اس حالت کا پتہ چل گیا ہو۔ کیوں نہ پہلے اس بات کی تسلی کر لی جائے۔" یہی سوچ کر اس نے پیچھے مڑ کر بوڑھے

کی طرف دیکھا اور بڑے ادب سے پوچھا۔ "پتا جی! آپ نے کچھ دیکھا تو نہیں؟۔ اگر دیکھا ہے تو بات کچھ سمجھ میں آئی ہے؟"۔

یہ سُن کر بوڑھا کچھ چونک سا گیا کہ آج داماد کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہا ہے۔ پھر بولا۔ "نہیں! کیا نہیں دیکھا؟۔ کیا نہیں سمجھا؟۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ ہوش میں تو ہے تو بیٹا!" بھولو دل ہی دل میں بہت خوش ہوا کہ ابھی تک سسر کو اس کی مصیبت کا پتہ نہیں چلا۔ پھر بات ٹالنے کے لیے بولا۔ "میں شہر کے شیش محل کی بات کر رہا تھا پتا جی! آپ نے شاید اسے نہیں دیکھا ہوگا۔ واقعی دیکھنے کی چیز ہے۔ پھر اگر دیکھا بھی ہو تو یہ نہیں معلوم ہوگا کہ یہ کس نے کب اور کیوں بنوایا تھا۔ خیر کوئی بات نہیں۔ اب کے جب آؤ گے تو ضرور دکھائیں گے آپ کو۔"

بوڑھا ہاں، ہاں کہتے ہوئے باہر چلا گیا۔ اور بھولو کی ساس کسی کام سے کمرے میں داخل ہوئی۔ بھولو نے موقع کو غنیمت سمجھ کر اس سے پوچھا۔ "ماں جی! سندری کہاں ہے۔ مجھے اس سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔ اگر تم دو منٹ کے لیے اسے بھیج دو تو میں چھت پر چلا جاتا ہوں۔"

"کوئی حرج نہیں بیٹا! تم چلو، میں اسے ابھی بھیجتی ہوں۔" بڑھیا نے کہا۔ بھولو چھت پر جا کر سندری کا انتظار کرنے لگا۔ چاند نکل آیا تھا۔ لیکن کبھی کبھی بادلوں میں چھپ جاتا تھا۔ ویسے بھی اندھیرا کافی ہوتا جا رہا تھا۔ اتنے میں کچھ لجاتی اور کچھ شرماتی ہوئی سندری بھی آہستہ آہستہ چھت پر پہنچ گئی۔ اور بھولو کو رام رام کہہ کر گردن جھکائے چپ چاپ کھڑی ہو گئی۔ بھولو بڑے دکھی سے لہجے میں بولا۔ "سندری۔"

"ہاں!" سندری نے شرماتے ہوئے کہا۔

بھولُو نے بغیر کسی شرم کے برتن سمیت اپنے دونوں ہاتھ اس کو دکھاتے ہوئے کہا۔ "سندری! کسی اور کو کیا بتاتا۔ مجھے اس مصیبت سے چھٹکارا دلاؤ۔"

"ہائے میں مر گئی۔" سندری نے نہ جانے کیا سمجھا۔ اس کی چیخ نکلتے نکلتے رُک گئی۔ پھر ذرا سنبھل کر بھولُو کے ہاتھوں کو ٹٹولتے ہوئے بولی۔ "میں تو ڈر ہی گئی تھی۔" بھولُو نے کہا۔ ڈرنا بعد میں۔ پہلے مجھے اس سے چھٹکارا پانے کی ترکیب جلدی بتاؤ۔ اگر کسی نے دیکھ لیا تو کیا ہوگا۔ سنا ہے تم بڑی عقل مند ہو۔ دکھاؤ تو ذرا اپنی عقل کا چمتکار۔"

"ٹھہرو! مجھے ذرا سوچنے تو دو۔ ابھی بتاتی ہوں کوئی ترکیب۔" سندری نے کہا۔

"سوچ بھی چکو نہ جلدی سے، میرے ہاتھوں میں تو کھجلی ہونے لگی ہے۔" بھولُو نے کہا۔ گردن کو ذرا اُوپر اٹھاتے ہوئے سندری نے کہا۔ "آگئی۔"

"کون؟" "ماں جی!" باپ رے باپ۔ اب کیا ہوگا۔ بھولُو نے گھبراتے ہوئے پُوچھا۔ سندری نے مُسکراتے ہوئے کہا۔ "ارے ماں نہیں، ترکیب آگئی۔"

"ترکیب آگئی ہے، تو ذرا جلدی سے بتاؤ۔ بڑی کھجلی ہونے لگی ہے۔ ان ہاتھوں میں۔" وہ بولا۔

سندری نے بڑے زور دارانہ انداز میں ترکیب بتانا شروع کی۔ "ارے سنو۔ ماں، باپو اور سب لوگ کمرے کے اندر ہوں گے۔ چپکے

سے کھٹکا کیے بغیر نیچے چلے جاؤ۔ صحن کے بائیں کونے میں بھینس باندھنے کے لیے ایک موٹا اور اُونچا سا کھونٹا گڑا ہے۔ جاکر برتن کو اس کھونٹے پر اس طرح سے مارو کہ اس کی کچّی گردن ٹوٹ جائے۔ جب برتن ٹوٹ جائے گا، تو ہاتھ اس کی قید سے آزاد ہو جائیں گے۔ بعد میں ہاتھ صاف کر لینا۔

"سندری! واقعی تم بڑی عقل مند ہو۔ میں ابھی نیچے جاتا ہوں بھولو خوش ہوکر بولا۔ اور چوروں کی طرح چپکے چپکے بغیر آہٹ کیے سیڑھیاں اترنے لگا۔ نیچے اور بھی گھپ اندھیرا تھا۔ صحن کے ایک کونے میں بھولو کو ایک کھونٹا سا دکھائی دیا۔ دل ہی دل بہت خوش ہوا۔ سندری نے ٹھیک ہی بتایا تھا۔ ہاں یہی ہوگا وہ کھونٹا۔ وہ چپکے چپکے دبے پاؤں اس کے پاس پہنچ گیا۔ برتن میں پھنسے ہوئے ہاتھوں کو اُونچا اٹھایا اور زور سے اس چمکتے ہوئے کھونٹے پر دے مارا۔ برتن تو ٹوٹ کر چکنا چور ہو گیا۔ لیکن اس کے ٹوٹنے کی آواز ایک دردناک انسانی چیخ میں دب کر رہ گئی۔

"اُف! یہ میں نے کیا کر دیا۔ کھونٹا کہاں۔ وہ تو میرا سسر بیٹھا تھا۔ جو شاید بجھی ہوئی چلم خالی کر کے اس کی کنکری تلاش کر رہا تھا۔ اب کیا ہو سکتا ہے۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ دوڑ کر پھر چھت پر چڑھنے لگا۔ ادھر باپ کی چیخ سُن کر سندری بھی جلدی جلدی چھت سے نیچے اتر رہی تھی۔ دونوں کی ٹکر ہوتے ہوتے بچ گئی۔ موقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بھولو نے سندری کے کرتے ہی سے ہاتھ صاف کر لیے اور خود بھی نیچے اتر آیا۔ اتنے میں بہت سے لوگ جمع ہو گئے۔ گھبراتے ہوئے ایک نوجوان

نے پوچھا۔ "چاچا! کچھ تو بتاؤ کہ ہوا کیا تھا۔" بوڑھا درد سے کراہتے ہوئے بولا "بیٹا! مجھے کچھ پتہ نہیں۔ لگتا ہے، آسمان سے کوئی تارا ٹوٹ کر میرے سر سے ٹکرا گیا ہے۔

برتن کے ٹھیرے نے سر سے بہتے ہوئے خون کو اور بھی گاڑھا بنا دیا تھا۔ اندھیرے میں سجھائی تو کچھ دیتا نہیں تھا۔ لوگ بوڑھے کے سر کو پکڑے حکیم صاحب! حکیم صاحب! پکار رہے تھے۔ ایک آدمی نے لیمپ لاکر صحن میں تھوڑی بہت روشنی کی۔ دوسرے کو حکیم صاحب کو بلانے کے لیے بھیجا گیا۔ ایک لڑکے کی نہ جانے کیسے، خون سے لتھڑی ہوئی اُنگلی اُس کی زبان پر لگ گئی۔ اسے کچھ میٹھا میٹھا سا لگا۔ شبہ دُور کرنے کے لیے اُس نے ایک بار پھر خون کو اُنگلی سے لگا کر چکھا تو واقعی وہ میٹھا تھا۔ اس بے چارے کو کیا معلوم کہ یہ سب ٹھیرے کی شرارت ہے۔ لگا زور زور سے چلّانے "ارے رامو! او شامو، او ہیرے، او موتی! چاچا کا خون کتنا میٹھا ہے۔ ذرا دیکھیو تو سہی چکھ کر۔"

ادھر بوڑھا بے چارہ درد سے کراہ رہا تھا۔ ادھر لوگ مذاق ہی مذاق میں بوڑھے کے خون کا ذائقہ چکھنے کے لیے اُس کے سر پر پل پڑے اور حکیم صاحب کے آتے آتے سر سے بہتا ہوا سارا خون ذائقہ دیکھتے دیکھتے ہی چاٹ گئے۔ حکیم صاحب کو زخم صاف کرنے کی بھی زحمت نہ اٹھانی پڑی۔ البتہ مرہم رکھ کر پٹّی ضرور کر دی۔

حکیم صاحب مرہم پٹّی کر کے چلے بھی گئے۔ لیکن بھولو لوگوں کی بھیڑ سے الگ کھڑا، ٹھیرے کی شرارت اور اپنی حماقت پر آنسو بہائے جا رہا تھا۔ لوگ یہ سمجھ کر کہ سعادت مند داماد کے لیے سسر کی تکلیف ناقابلِ برداشت ہو رہی

ہے۔ اسے دلاسا دینے لگے۔ بھولُو کے آنسوؤں کو ہمدردی سے تعبیر کیا گیا۔ اس کے سسرال والوں میں بھولُو کی عزّت کو چار چاند لگ گئے۔ یہ راز چوں کہ سندری کے سوا کسی اور کو معلوم نہ تھا۔ اس لیے بھولُو نے اسی کے سامنے پھر کبھی شیرہ نہ کھانے کی قسم کھائی۔ تو سندری نے بھی شیرے کی شرارت کے راز کو راز ہی رکھنے کا عہد کیا۔

کامیاب جھوٹا

پُرانے زمانے میں اکثر راجے مہاراجے اپنی بیٹی کی شادی کے سلسلے میں سوئمبر رچایا کرتے تھے۔ یہ سوئمبر ایک ایسی تقریب ہوتی تھی جس کے تحت لڑکی کی شادی کے لیے کوئی عجیب و غریب شرط رکھ دی جاتی تھی۔ شادی کے خواہشمند بہت سے لوگ اس شرط کو پورا کرنے کے لیے آتے تھے۔ ان میں سے کئی تو جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے تھے یا پھر عمر بھر جیل کی ہوا کھاتے تھے۔ جو خوش نصیب ان شرطوں کو پورا کرنے میں کامیاب ہوتا تھا، اسی کی شادی راجا کی بیٹی سے ہو جایا کرتی تھی۔

ایک دفعہ ایک راجہ نے اپنی بیٹی کے سوئمبر کے لیے ایسی احمقانہ شرط رکھ دی جسے پورا کرنے میں بڑے بڑے نامی گرامی اور اپنے فن میں یکتا لوگ ناکام ہو گئے۔ راجا کے اعلان کے مطابق شرط یہ تھی کہ جو بھی شخص راجا کو تین دن تک لگاتار تازہ ترین جھوٹ سُنائے اور راجا بھی انھیں جھوٹ تسلیم کرلے، اسی کامیاب جھوٹے کی شادی راجا کی بیٹی سے طے پائے گی اور وہ راجا کا جانشین بھی تسلیم کرلیا جائے گا۔ لیکن اگر شرط پورا کرنے کے لیے میدان میں اُترنے والا جھوٹ کی کسوٹی پر پورا نہ اُترے تو زندگی کے باقی دن اسے جیل میں گزارنے پڑیں گے۔

یہ راجا بہت چالاک تھا۔ سوئمبر کا اعلان کرنے کے بعد اس نے اپنے دو ہوشیار اور مکّار وزیروں پر مشتمل ایک فیصلہ کمیٹی بنائی۔ یہ دونوں وزیر جھوٹ اور سچ کا فیصلہ کرنے میں راجا کے صلاح کار تھے۔ خفیہ طور پر راجا نے ان دونوں کو سخت تاکید کر دی تھی کہ جو بھی شخص جھوٹ بولنے کے لیے دعوا سے میدان میں آئے اس کے پہلے دو جھوٹ تو پہلے ہی تسلیم کر لیے جائیں لیکن تیسرا جھوٹ خواہ کتنا ہی سفید جھوٹ کیوں نہ ہو، ہرگز تسلیم نہ کریں بلکہ دلیلوں کے ذریعے اُسے سچ ثابت کر دیں۔

راجا کا اعلان سُن کر بہت سے جھوٹوں کے مَن میں لڈّو پھوٹنے لگے۔ راج کماری سے شادی اور راجا کی جانشینی کا لالچ دُور دراز کے خاندانی جھوٹوں کو راجدھانی کی طرف کھینچ کھینچ کر لانے لگا۔ سب نے ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر جھوٹ بولنے کی کوشش کی۔ مگر اپنے پلان کے مطابق راجا اور اس کی صلاح کار کمیٹی نے ان کے بیانات کو جھوٹ تسلیم نہ کیا اور وہ سب جیل کی کوٹھریوں میں بند کر دیے گئے۔

آخر کار ایک ایسا آدمی جو عقل مندی اور ہوشیاری میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا، میدان میں اُترا اور اپنے جھوٹ پیش کرنے کے لیے راجا سے اجازت چاہی۔ راجا نے فوراً اگلے ہی دن کے لیے ایک وقت مقرر کر دیا کہ وہ دربار میں آکر اپنے جھوٹ پیش کرے وہ خوشی خوشی اپنے گھر لوٹ آیا۔ اگلے دن تماشائیوں کا بے پناہ ہجوم جھوٹی داستان سے لطف اندوز ہونے کے لیے دربار میں جمع تھا۔ ایک اُونچے چبوترے پر راجا اور اس کی صلاح کار کمیٹی جلوہ افروز تھی۔ اتنے میں جھوٹا بھی دربار میں حاضر ہو گیا۔ وہ اگرچہ اپنے مقررہ وقت سے تین چار منٹ دیر سے پہنچا تھا پھر

بھی راجا نے اسے اپنا پہلا جھوٹ بیان کرنے کی اجازت دے دی۔ اس نے اپنا پہلا جھوٹ اس طرح بیان کرنا شروع کیا۔

"مہاراج! آج صبح جب میں آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کے لیے تیار بیٹھا تھا رسوئی سے میری ماں نے آواز دیتے ہوئے کہا۔ بیٹا! نمک ختم ہو گیا ہے۔ بھاگ کر ذرا جلدی سے ایک تھیلی نمک تو لا دو۔ سوچا ایک مُبارک کام کے لیے جا رہا ہوں،... ماں کے حکم کی تعمیل کر کے کیوں نہ اس کی دُعائیں لیتا جاؤں۔ ایک خالی بوری بغل میں دبائی اور نمک لانے کے لیے چل پڑا۔ قدم ابھی دروازے سے باہر رکھا ہی تھا کہ صحن میں اپنے راکٹ رفتار مُرغے کو کھڑا پایا۔ سوچا اسی پر بیٹھ کر نمک لے آتا ہوں ورنہ آپ کے پاس آنے میں دیر ہو جائے گی۔ میں نے کاٹھی کی جگہ سے وہی بوری مُرغے کی پیٹھ پر ڈالی اور اس سے کہا، چل بھائی مُرغے ذرا نمک لے آئیں۔ یہ سُنتے ہی مُرغے نے ایک ایسی اُڑان بھری کہ ہم ایک ہی منٹ میں ستر میل کی دُوری پر واقع نمک کے پہاڑ پر پہنچ گئے۔ میں نے جلدی جلدی بوری میں نمک بھرا اور بوری کا مُنہ سی کر مُرغے کو آواز دی۔ لیکن مُرغا ندارد۔ اِدھر اُدھر دیکھا تو نمک کی چٹّان کے مُرغا ایک خون خوار بھیڑیے کی چھاتی پر سوار ہے اور چونچیں مار مار کر اسے لہو لہان کیے جا رہا ہے۔ پیار سے پُچکار کر مُرغے کو منایا۔ اور نمک کی بوری اس کی پیٹھ پر لاد کر واپس گھر چلنے کے لیے کہا۔ راستے میں اس نے بتایا کہ وہ نمک حرام بھیڑیا تم پر حملہ کرنا چاہتا تھا۔ منع کرنے پر بھی باز آتا دِکھائی نہ دیا تو میں نے لپک کر اسے دبوچ لیا۔ اگر تم بیچ میں نہ پڑتے تو میں اسے کچّا چبا جاتا۔ مُرغا ابھی اپنی بات ختم بھی نہ کر پایا تھا کہ ہم گھر پہنچ گئے۔ جلدی سے میں نے نمک کی بوری ماں کے حوالے کی اور مہاراج کی خدمت میں حاضر ہو گیا

ہوں۔ مہاراج! میرا مُرغا بہت تھکا تھکا سا لگ رہا تھا۔ اگر آپ اجازت دیں تو جاکر اس کی بھی خبر لوں۔"

راجا یہ سُن کر مُسکرایا اور اپنے صلاح کاروں کی طرف دیکھنے لگا۔ صلاح کاروں نے باہم مشورہ کرکے اس تازہ واردات کو جھوٹ تسلیم کرنے کی صلاح دی۔ راجا نے لوگوں کے ہجوم کے رو برو فیصلہ سُنایا کہ تمھارا یہ پہلا جھوٹ تسلیم کیا جاتا ہے۔ جاؤ اور جاکر اپنے مُرغے کی خبر لو۔ کل ٹھیک اسی وقت اپنا دوسرا جھوٹ سُنانے کے لیے حاضر ہونا ہوگا۔

دوسرے دن جب وہ دربار میں حاضر ہوا تو دربار حسبِ معمول تماشائیوں سے بھرا پڑا تھا۔ جاتے ہی اس نے اپنی تازہ ترین واردات سُنانی شروع کی۔

"مہاراج! کل جب آپ نے مجھے گھر جانے کی اجازت دی تو مَیں تیر کی طرح سیدھا اپنے گھر پہنچا۔ دیکھا تو مُرغا ہنوز تھکا تھکا سا سُست اور اُداس کھڑا تھا۔ سوچا کہ اس بہادر مُرغے نے ایک تو خوں خوار بھیڑیے پر اپنی طاقت صَرف کر دی دوسرے نمک کی وزنی بوری لانے سے بے چارے کی رہی سہی طاقت بھی جواب دے گئی۔ ایسا نہ ہو کہ اس کا دل یا پھیپھڑے زخمی ہو گئے ہوں۔ یہی دیکھنے کے لیے مَیں نے چاقو اُٹھایا اور دھیرے دھیرے اس کا سینہ چاک کرنا شروع کر دیا۔ دیکھا تو بے چارے کے دل کی حالت ایسی خستہ تھی جیسے اس پر سینکڑوں ہل چل چُکے ہوں۔ یہی سوچ کر کہ اب اس میں مزید ہل چلانے کی ضرورت نہیں کیوں نہ ایسی زرخیز جگہ پر خربوزے ہی بو دیے جائیں۔ لہٰذا مَیں نے چند ایک خربوزے کے بیج لیے اور اس میں بو دیے۔ پھر باہر نل سے پانی لاکر اس کی خوب سینچائی بھی کی اور رات بے فکر ہو کر سو گیا۔ صبح اُٹھتے ہی مجھے مہاراج کی خدمت

میں حاضر ہونے کی فکر تھی۔ اسی لیے اپنے ضروری کاموں سے فارغ ہوکر جلدی سے تیار ہوگیا۔ چلنے سے پہلے جب میں نے کل کی بوئی ہوئی کھیتی پر نظر ڈالی تو کیا دیکھتا ہوں کہ خربوزے کی ایک بڑی سی بیل پورے صحن میں پھیلی ہوئی ہے۔ اور اس میں خربوزے ہی خربوزے لگے ہوئے ہیں۔ پہلی نظر میں صرف دو ایک خربوزے ہی پکے ہوئے نظر آئے۔ لیکن دیکھتے ہی دیکھتے خربوزے کو دیکھ کر خربوزے نے رنگ بدلنا شروع کیا اور کچھ ہی دیر میں بے شمار خربوزے پک کر خود ہی بیلوں سے الگ ہونے لگے۔ اتنے بڑے بڑے اور عمدہ خربوزے دیکھ کر میرے دل میں آیا کہ کیوں نہ مہاراج کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے ایک آدھ خربوزہ لیتا چلوں۔ دوسرے ہی لمحے دل میں خیال آیا کہ کل اسی ٹٹو پر تو نمک کی بوری لاد کر لایا تھا۔ ایسا نہ ہو کہ نمک خربوزے میں اثر کر گیا ہو۔ بہتر ہے کہ پہلے ایک خربوزے کو چکھ کر دیکھ لوں۔ چکھنے کے لیے خربوزے کو جب کاٹا گیا تو چاقو پھسل کر خربوزے کے اندر جا گرا۔ وہی تو ایک چاقو تھا جس سے ماں کو ابھی سبزی کاٹنی تھی۔ لہٰذا چاقو کی تلاش شروع کر دی۔ مگر چاقو کا کہیں پتہ نہ چلتا تھا۔ پورا بازو خربوزے کے اندر ڈال دیا لیکن چاقو کا پتہ تو تب چلتا جب ہاتھ خربوزے کی تہہ تک پہنچ پاتا۔ غصے میں آکر میں نے خود ہی خربوزے کے اندر چھلانگ لگا دی۔ اور چاقو ڈھونڈنے کی سر توڑ کوشش کرنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر بعد کیا دیکھتا ہوں کہ دوسری طرف سے کئی آدمیوں کا قافلہ میری طرف چلا آرہا ہے۔ قریب آکر انھوں نے مجھ سے پوچھا۔ "بھئی! کیا ڈھونڈ رہے ہو یہاں"۔ میں نے بڑی مایوسی سے جواب دیا۔ "کیا بتاؤں بھائی! یہیں کہیں میرا چاقو گر گیا ہے۔ بس اسی کو تلاش کر رہا ہوں"۔ میرے اس جواب پر وہ قہقہے لگا کر کافی دیر تک ہنستے رہے۔

مَیں نے پُوچھا۔ "بھائیو! آپ میری مُصیبت پر ہنس کیوں رہے ہیں؟" تو کہنے لگے۔ "بھلے آدمی، پاگل ہو گئے ہو کیا۔ کل اسی خربوزے میں تو ہمارے پانچ اُونٹ غائب ہو گئے تھے۔ اتنے بڑے بڑے جانور ہمیں ابھی تک نہیں مِلے، تمھارا ذرا سا چاقو بھلا کہاں سے مِل جائے گا؟" یہ سُن کر مَیں نے سوچا کہ چاقو تو گیا ہاتھ سے اب۔ مہاراج کی خِدمت میں پہنچنے میں مزید دیر نہیں کرنا چاہیے۔ چنانچہ مَیں اپنی بدنصیبی پر آنسو بہاتا ہوا خربوزے سے باہر نِکل کر سیدھے آپ کی خِدمت میں حاضر ہو گیا ہوں۔

جھوٹے کی بات سُن کر راجا اور اس کے صلاح کار بھی کافی دیر تک ہنستے رہے۔ ذرا خاموش ہوئے تو راجا نے کہا۔ "بھئی واہ! واقعی بڑا دِل چسپ جھوٹ ہے۔ جھوٹے! تم نے سب کو خوش کر دیا۔ اسی خوشی میں ہم نے تمھارا دوسرا جھوٹ بھی تسلیم کر لیا ہے۔ اب تمھیں اجازت ہے جہاں جی چاہے جاؤ۔ کل اسی وقت اپنے جھوٹ کی آخری کڑی پیش کرنے کے لیے حاضر ہو جانا۔

تیسرے دن مقررہ وقت سے ذرا پہلے ہی دربار سج گیا تھا۔ راجا اور اس کے صلاح کار اسی اُونچے تخت پر اپنا فیصلہ سُنانے کے لیے بیٹھے تھے۔ دربار تماشائیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ لیکن جھوٹا ابھی تک نہیں پہنچا تھا۔ سب کی نظریں اسی کے راستے پر لگی ہوئی تھیں۔ اچانک کیا دیکھتے ہیں کہ کافی دُور سے جھوٹا روتا، پیٹتا، چیختا، چِلّاتا چلا آ رہا ہے۔ "ہائے مَیں لُٹ گیا، برباد ہو گیا، مَیں کہیں کا نہ رہا۔ مہاراج کی دُہائی ہے۔ اپنی پرجا کو بربادی سے بچائیے۔ مہاراج! مَیں انصاف چاہتا ہوں۔" یہی رٹ لگاتے

ہوئے وہ دربار میں داخل ہوا۔ اور کھڑا زار و قطار روتا رہا۔ بھرے دربار میں خاموشی کا عالم طاری تھا کہ راجا نے دِلاسا دیتے ہوئے اسے حوصلے سے کام لینے کو کہا۔ لیکن جھوٹا پھر بھی روتا رہا۔ راجا نے پھر ذرا اور نرمی سے پوچھا، بھائی! کچھ بتاؤ تو آخر معاملہ کیا ہے اور کِس نے تمھیں تکلیف پہنچائی ہے۔ یہ سُن کر جھوٹے کو ذرا تسلّی ہوئی تو سسکیاں لیتے ہوئے بولا۔ "مہاراج! کل آپ سے اجازت حاصل کر کے مَیں اپنے گھر لوٹ رہا تھا۔ ابھی تھوڑی ہی دُور گیا تھا کہ پیچھے مُڑ کر دیکھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ آپ کے یہ دونوں صلاح کار میرا پیچھا کر رہے ہیں۔ سوچا کہ اپنے کسی کام سے جا رہے ہوں گے۔ مجھے پوچھ کر کیا لینا ہے۔ مَیں اپنے راستے پر چلتا رہا۔ لیکن انھوں نے میرا پیچھا کرنا نہیں چھوڑا۔ آخر جب میں اپنے گھر پہنچ گیا تو یہ بھی میرے گھر کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ اور کچھ دیر تک میرے گھر کے محل وقوع کا جائزہ لیتے رہے۔ پھر اچھی طرح سے دیکھ بھال کر واپس آ گئے۔ رات کے پچھلے پہر یہی دونوں بھیس بدل کر میرے گھر میں داخل ہوئے۔ میری آنکھ کُھل چکی تھی۔ بہتیرا کہا کہ مَیں نے تمھیں اچھی طرح پہچان لیا ہے۔ آپ جیسے بڑے آدمیوں کو یہ حرکت زیب نہیں دیتی لیکن انھوں نے میری ایک نہ سُنی اور میری ماں کا سونے کا سارا زیور اور نقدی وغیرہ سمیٹ کر چلتے بنے۔ مہاراج! خدا کے لیے میرا مال واپس دِلا دیجیے۔ مَیں بہت غریب آدمی ہوں۔ کہیں کا نہ رہوں گا۔" یہ کہہ کر وہ پھر زور زور سے رونے پیٹنے لگا۔

یہ سُن کر راجا نے غُصّے سے اپنے صلاح کاروں کی طرف دیکھ کر پُوچھا۔ "کیوں بھئی! یہ کیا کہہ رہا ہے۔ سُنا آپ نے؟" دونوں صلاح کار ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے۔ اور بولے "مہاراج! ہم نے اس کا ہرگز پیچھا نہیں کیا۔

اس کا گھر تو کیا ہمیں اس کے محلّے تک کا بھی علم نہیں۔ رہی چوری کرنے کی بات یہ ہم پر خواہ مخواہ الزام لگا رہا ہے۔ اور سراسر جھوٹ بولتا ہے۔

راجا نے قدرے سختی سے پھر پُوچھا۔ "تو کیا یہ بھرے دربار میں جُھوٹ بولتا ہے؟" تو صلاح کاروں نے پھر زور دے کر کہا۔ "ہاں مہاراج، یہ سراسر جُھوٹ بول رہا ہے۔" راجا کے تیسری بار پوچھنے پر بھی صلاح کاروں نے یہی جواب دیا کہ حضور یقین کریں، ہم نے چوری نہیں کی۔ یہ شخص سراسر جُھوٹ بول رہا ہے۔ سفید جُھوٹ۔

راجا کو غصہ آگیا۔ وہ اُس شخص کو ڈانٹتے ہوئے بولا۔ "میرے وزیر ایسی حرکت نہیں کرسکتے تم جھوٹ بول رہے ہو....."

یہ سُن کر جُھوٹا وہیں کھڑے کھڑے خوشی سے اُچھلنے،کُودنے اور تالیاں بجانے لگا۔ اس کے ساتھ ہی سبھی تماشائیوں نے بھی تالیاں بجانی شروع کردیں۔ "مہاراج! میں تینوں بار جھُوٹ بولنے میں کامیاب ہوگیا ہوں اور تینوں بار آپ بھی اسے تسلیم کرچُکے ہیں۔ اب آپ اپنا وعدہ پورا کیجیے۔ یہ سُن کر راجا اور اس کے صلاح کاروں کے ہوش ٹھکانے آئے۔ لیکن وہ بازی ہار چُکے تھے۔ ان کے پاس اب کوئی بہانہ نہ تھا۔ چنانچہ راجا نے نہ صرف اپنی بیٹی کی شادی اس کامیاب جُھوٹے کے ساتھ کردی بلکہ اُسے اپنے تخت و تاج کا وارث بھی تسلیم کرلیا۔

جب جھوٹا اس مُلک پر راج کرنے لگا تو سب سے پہلا کام اس نے یہ کیا کہ اُن تمام لوگوں کو جیل سے رہا کر دیا جنھیں راجا اور اس کے صلاح کاروں نے اپنی طے شدہ چالاکی کے ذریعے جیل میں بند کر رکھا تھا۔

نہلے پر دہلا

ایک لالہ جی اپنے آپ کو بہت ہوشیار سمجھتے تھے۔ چالاکی سے دوسروں کا مال ہضم کر کے ان کی توند روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ ایک دن انھوں نے کسی جاٹ سے گھی کا ایک مٹکا اُڑا لیا۔ اب اسے شہر پہنچانے کے لیے بھی کسی ایسے مزدور کی تلاش کرنے لگا جو مُفت میں یہ کام کر دے مگر اس زمانے میں مُفت کا مزدور کہاں سے مِلتا۔

اسی گاؤں میں ایک غریب آدمی بھی رہتا تھا۔ اس کا نام تھا کلّو۔ آج صُبح سے اُسے کوئی کام نہ مِلا تھا۔ وہ بھی گھُومتا پھِرتا اِدھر ہی آ نکلا۔ کلّو کو پھانسنے کے لیے لالہ جی چالاک لومڑی کی طرح اس کی خوشامد کرنے لگے۔ وہ بھلا ایسا کیوں نہ کرتے! ایک پھُول کے لیے سو کانٹوں کا احسان اُٹھانا پڑتا ہے۔ بڑی نرمی سے بولے "کلّو بھائی! تمھاری تو بڑی لمبی عُمر ہوگی۔ مَیں ابھی ابھی تمھیں یاد ہی کر رہا تھا۔ کہ تم آ گئے۔ اچھے آدمی کو بھلا کون نہیں یاد کرتا۔ سچ تو یہ ہے کہ دِل کو دِل سے راہ ہوتی ہے۔ تمھارا باپ بھی بہت بھلا آدمی تھا۔ ہمارے لالہ جی کو جب بھی کوئی کام پڑتا تھا تو وہ اُسی کو بُلا بھیجتے تھے۔ مُحبت اور پریم کی بات ہے۔ ہمیں بھی جب کوئی ضرورت پڑتی ہے تو ہمیشہ تم کو ہی یاد کرتے ہیں۔

کوئی دوسرا چاہے ہماری منتیں بھی کیوں نہ کرے، ہم کبھی مُنہ نہیں لگاتے۔"

کلّو سمجھ گیا کہ خوشامد کا جال بغیر مطلب کے نہیں بچھایا جا رہا۔ بھولا سا بن کر بولا۔ "کیوں نہیں لالہ جی! اِسی لیے تو کہتے ہیں کہ دُور کے بھائی سے پاس کا کُتّا اچھا ہوتا ہے۔ ہم نے بھی تو کبھی انکار نہیں کیا۔ کہو لالہ جی! میں آپ کی کیا سیوا کروں۔" لالہ جی بولے "کام تو کوئی خاص نہیں۔ گھی کا مٹکا شہر لے جانا تھا۔ سوچ رہا تھا کلّو کو ساتھ لیتا چلوں تو وہ بھی شہر کی سیر کر آئے گا۔" بے کار سے بیگار بھلی سمجھ کر کلّو نے کہا۔ "کیا حرج ہے لالہ جی! چلا چلوں گا۔ دو روپے دے دینا۔" لالہ جی کو کلّو سے ایسی اُمّید نہ تھی۔ سُن کر ایک دم چونک پڑے۔ "دو روپے؟" وہ کاہے کے کلّو۔ شہر کوئی زیادہ دُور تھوڑے ہی ہے۔ صرف چار ہی میل تو جانا ہے۔ باتیں کرتے کرتے پہنچ جائیں گے۔" کلّو نے جواب دیا۔ میں تو چلا جاؤں گا لالہ جی! لیکن مہنگائی کے زمانے میں بیوی بچّوں کو خیرات گھر تھوڑے ہی بھیج دوں گا۔"

سیدھی اُنگلی گھی نہ نِکلتے دیکھ کر لالہ جی نے دل ہی دل میں ایک ایسی تدبیر سوچی جس سے سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ پھر وہی چکنی چُپڑی باتیں کرتے ہوئے بولا۔ "کلّو بھائی! دِل توڑنے والی باتیں نہ کیا کرو۔ ہم تو پریم سے کہہ رہے ہیں۔ ورنہ لے جانے کو کسی اور بھی لے جا سکتے ہیں۔ خیر تمھاری خاطر دو روپے کی بھی کوئی بات نہیں۔ مگر خیال رکھنا۔ مہنگے بھاؤ کا گھی ہے۔ ذرا سنبھل کر چلنا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ . . . ."

کلّو اُن کی نیت کو جانتا تھا۔ بولا۔ "فکر نہ کرو لالہ جی۔ میں کوئی بچہ تھوڑے ہی ہوں جو تمھارا گھی برباد کر دوں گا۔" یہ کہہ کر مٹکا سر پر اُٹھایا

اور لالہ جی کے ساتھ چل دیا۔ ابھی تھوڑی ہی دُور گئے تھے کہ مٹکے کی اُوپری چکنائی گرمی سے پگھل کر چھلکنے لگی۔ لالہ جی کے دِل میں بے ایمانی تو تھی ہی۔ کہنے لگے۔ "کلّو! گھی شاید چھلک رہا ہے۔ ذرا سنبھل کر چلو۔" کلّو بے چارہ تو پہلے ہی بہت سنبھل کر چل رہا تھا۔ اب اور بھی چوکس ہو کر چلنے لگا۔ اور تھوڑی دُور جا کر لالہ جی نے پھر ٹوکا اور مٹکے پر ہاتھ پھیر کر چکنائی دِکھاتے ہوئے کہنے لگے۔ "دیکھ لو کلّو، تمھاری لاپرواہی سے کتنا گھی برباد ہو گیا ہے۔ سوچ لو۔ پھر نہ کہنا۔" کلّو کچھ نہ بولا اور چُپ چاپ چلتا رہا۔

جیسے جیسے شہر کے قریب پہنچتے گئے۔ لالہ جی اور بھی زیادہ رعب جماتے گئے۔ اب کے وہ بولے۔ "سوچا تھا کلّو بڑا عقل مند آدمی ہے۔ لیکن کلّو تم نے تو سارے گھی کا ستیاناس کر دیا ہے۔ تمھارے جیسے اور دو چار مزدوروں سے پالا پڑ جائے تو ہمارا تو دو ہی دن میں دِوالہ نکل جائے۔" کلّو کو غصّہ تو بہت آیا۔ لیکن ضبط کر گیا۔ ٹھیک اسی دوکان پر پہنچ کر جہاں کہ مٹکا اُتروانا تھا، لالہ جی شیر کی طرح گرجے "پتہ نہیں کہاں سے آجاتے ہیں یہ عقل کے دشمن۔ دوسروں کے مال کی تو کچھ پرواہ ہی نہیں کرتے۔ اُلٹا مُنھ پھاڑ کر جواب دیتے ہیں" دو روپے دے دینا لالہ جی۔ "اب میرے اس نقصان کو تمھارا باپ پورا کرے گا۔ بیسیوں بار کہا تھا کہ سنبھل کر چلو۔ پھر بھی مست ہاتھی کی طرح جھومتا ہوا چلا آیا ہے۔ اب تو ایک پیسہ بھی نہیں دوں گا حرام خور کو۔ اُتار دو یہیں پر ہمارا مٹکا۔"

کلّو تو پہلے ہی لالہ جی کی اس نیت کو بھانپ چُکا تھا۔ وہ اور زیادہ برداشت نہ کر سکا۔ اور غُصّے سے کانپنے لگا۔ لالہ جی پھر چیخے "ابھی کچھ کسر باقی ہے کیا۔ کھڑے کھڑے میرا مُنہ کیا دیکھ رہے ہو۔ سُنتے نہیں ہو۔ اُتار دو یہیں

پر مٹکا۔" غصّے سے بھرے ہوئے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ وہ بھی پھٹ پڑا۔" کیا مٹکا مٹکا لگا رکھا ہے۔ کہیں کھائے تھوڑے ہی جا رہا ہوں تمہارا مٹکا۔ لے سنبھال لے اسے۔" کہتے ہوئے مٹکا دھڑام سے زمین پر دے مارا۔ زمین پر گرتے ہی مٹکا چکنا چُور ہو گیا۔ گھی کو مٹّی میں مِلتے دیکھ کر لالہ جی سر پیٹتے اور شور مچاتے رہ گئے۔ کلّو نے آنکھ اُٹھا کر بھی اس طرف نہ دیکھا اور گھر کی طرف چل دیا۔

کلّو کو واپس جاتے دیکھ کر لالہ جی کو جان کے لالے پڑ گئے۔ رات کے وقت اکیلے سفر کرنے کے خیال ہی سے لالہ جی کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ جان کے مقابلے میں گھی کی بھلا کیا قیمت تھی۔ لالہ جی کا سارا جوش ٹھنڈا ہو گیا۔ سوچا اس وقت تو "کُتے" کا مُنہ نوالے سے سی دینا ہی بہتر ہے۔ چنانچہ خوشامد درآمد کر کے پھر کلّو کو منانے لگے۔" ارے کلّو! کہاں جا رہے ہو۔ پاگل نہ بنو۔ مجھے پتہ ہے۔ تم نے جان بوجھ کر تھوڑے ہی مٹکا توڑا ہے۔ گھی ہماری قسمت میں نہیں تھا۔ اور مٹکے کو بھی ٹوٹنا ہی تھا۔ سو ٹوٹ گیا۔ اب تم کہاں بھاگے جا رہے ہو۔ تو یہ اپنے دو روپے تو لیتے جاؤ۔ اور سُنو مجھے دو ایک چیزیں خریدنی ہیں۔ وہ مجھے خریدنے دو پھر ساتھ ساتھ چلیں گے۔" کلّو واپس آ گیا اور سوچنے لگا کہ دو روپے تو مل ہی رہے ہیں۔ تھوڑی دیر اور رُک جانے میں کیا حرج ہے۔ روپے لے کر جیب میں ڈالے اور لالہ جی کا انتظار کرنے لگا۔

لالہ جی نے پہلے تو ایک دوکان سے لال شربت کی ایک بوتل خریدی۔ پھر حلوائی کی دوکان سے مٹھائی کا ایک ڈبّہ لیا۔ اور اس کے بعد کچھ اور سامان خرید کر واپس آ گئے۔ اور کلّو سے کہنے لگے " دیکھو کلّو! اس ڈبّے میں تو سانپ اور بِچھو ہیں۔ اور اس بوتل میں لال زہر ہے۔

یہ دونوں چیزیں تو مَیں خود اُٹھا لیتا ہوں۔ اور باقی سامان تم اُٹھا لو۔ کلّو، لالہ جی کی سب چالاکی سمجھتا تھا۔ پھر بھی اسے چڑھانے کے لیے کہنے لگا۔ "لالہ جی! نقصان تو آپ کا ضرور ہو گیا ہے۔ مجھے بھی اس کا بہت افسوس ہے۔ لیکن اب یہ زہر پی کر مرنے سے کیا فائدہ۔ اگر مرنا ہی تھا تو ایک چھوٹی سی زہر کی شیشی ہی کافی تھی۔ اتنی بڑی بوتل سے کیا سبھی گھر والوں کو زہر دے کر سانپوں اور بچھوؤں سے کٹواؤ گے۔"

لالہ جی بڑی سنجیدگی سے بولے "نہیں کلّو، یہ چیزیں تو اپنے حکیم رام کشور نے منگوائی ہیں۔ کوئی دوا وغیرہ بنانی ہو گی۔ ہمیں اس سے کیا مطلب۔ تمہارے بھلے کے لیے کہہ رہا تھا کہ کہیں غلطی سے چھو نہ لینا۔ کہنے کو تو کلّو بہت اچھا کہہ کر چپ ہو رہا۔ مگر مٹھائی کے خیال ہی سے بار بار اس کے منہ میں پانی آ رہا تھا۔ اس لیے وہ اس ڈبے اور بوتل کو اُڑانے کی ترکیبیں سوچنے لگا

اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے کرتے جب وہ اپنے گاؤں کے قریب پہنچے تو کافی اندھیرا ہو چکا تھا۔ لالہ جی کو پاخانے کی حاجت محسوس ہوئی۔ سوچا گھر سے پھر واپس آنا پڑے گا، کیوں نہ ابھی ہو آؤں۔ لالہ جی اپنے آپ سے جھوٹ موٹ کہنے لگے۔ "حکیم صاحب کے سودے کی سر دردی بھی مَیں نے خواہ مخواہ مول لی ہے۔ بوتل کا منہ تو خیر بند ہے۔ لیکن ڈبے میں بند سانپوں اور بچھوؤں سے بڑا بچ بچا کر چل رہا ہوں۔ کہ کہیں کاٹ نہ کھائیں۔" پھر کلّو سے کہنے لگے۔ "کلّو! مَیں ذرا پاخانے ہو آؤں، تم حکیم صاحب کی ان چیزوں کا بھی دھیان رکھنا۔"

کلّو تو پہلے ہی موقعے کی تلاش میں تھا۔ دل ہی دل میں بہت خوش ہوا۔ لیکن اپنا بھولا پن ظاہر کرنے کے لیے کہنے لگا۔ "لالہ جی! غریب آدمی کو کیوں موت کے مُنہ میں دیتے ہیں۔ انھیں اپنے ساتھ ہی لیتے جاؤ۔ مجھے ان سے بہت ڈر لگتا ہے۔" لالہ جی کو یقین ہوگیا کہ کلّو واقعی اس کی باتوں میں آگیا ہے۔ اور ڈبے اور بوتل سے ڈر رہا ہے۔ لالہ جی بڑی بے فکری سے دُور ایک جھاڑی کی اوٹ میں جاکر بیٹھ گئے۔

کلّو نے موقعے سے فائدہ اُٹھا کر پہلے تو کچھ ٹیڑھی میڑھی لکیریں ڈبے سے لے کر ایک جھاڑی تک کھینچ دیں۔ پھر ڈبّہ کھول کر مٹھائی چٹ کر گیا۔ اس کے بعد وہ ڈبّے سے تھوڑی دُور جاکر کھڑا ہوگیا اور چِلّا چِلّا کر لالہ جی کو پُکارنے لگا۔ "لالہ جی! جلدی آؤ۔ حکیم صاحب کا ڈبّہ حرکت میں آنے لگا ہے۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ ذرا بھاگ کر آجاؤ نا۔ لو اس کا تو ڈھکنا بھی کُھل گیا۔ لالہ جی بھاگ کر آؤ۔ یہ سانپ مجھے کاٹ کھائیں گے۔"

لالہ جی دھوتی سنبھالتے ہوئے بھاگے۔ آکر دیکھا تو ڈبّہ خالی پڑا تھا۔ خالی ڈبّے کو دیکھ کر اناپ شناپ بکنے لگے۔ کلّو نے صفائی پیش کرتے ہوئے کہا۔ "لالہ جی! ابھی ابھی دو تین چھوٹے چھوٹے سنپولیے تو اس جھاڑی میں گھُسے ہیں۔ یقین نہ ہو تو ان کے نشان بھی دِکھا سکتا ہوں۔ ذرا دِیا سلائی جلاؤ تو . . ." لالہ جی بہت سٹپٹائے۔ اور غصّے میں لال پیلے ہوکر بولے "ارے کلّو کے بچّے! اس میں سانپ اور بچھو کہاں سے آگئے۔ اس میں تو مٹھائی تھی۔"

کلّو بھی بناوٹی غُصّے سے بھڑک اُٹھا۔ اور واہی تباہی بکتے ہوئے لالہ جی پر برس پڑا۔ "تم بڑے بے ایمان ہو۔ دو منٹ پہلے تک تو سانپ اور بچھوؤں کی دُہائی دے کر حکیم صاحب کی جان کو رو رہے تھے۔ اب اس میں مٹھائی کہاں

سے آ گئی۔ اتنی دُور شہر سے جب اکیلے گھر لوٹنا پڑ رہا تھا۔ تو مارے خوف کے دم خُشک ہو رہا تھا۔ اس وقت تو گدھے کو بھی باپ بنانے کے لیے تیار تھے۔ لیکن مطلب نکل جانے پر شیر بنتے جا رہے ہو۔ احسان تو کیا مانتے۔ اُلٹا الزام لگا رہے ہو۔ جب راستے ہی میں یہ حال ہے کہ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتے تو گھر جا کر پتہ نہیں کیا کیا طوفان اُٹھاؤ گے۔ خدا جس کو مُنہ دیتا ہے، اُسے روٹی بھی دیتا ہے۔ تمھارا دِیا ہی نہیں کھاتا ہوں۔ مَیں غریب ضرور ہوں۔ لیکن عزّت دار آدمی ہوں۔ ایسی بے عزّتی برداشت نہیں کر سکتا۔ آپ نے سمجھ کیا رکھا ہے۔ ابھی آپ کے سامنے جان دے دوں گا۔ بس اب مجھے روکنے کی کوشش نہ کرنا۔ ابھی زہر پی کر مرتا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے لالہ جی کے ہاتھ سے شربت کی بوتل چھین کر غٹا غٹ پی گیا۔ لالہ جی کھڑے مُنہ دیکھتے رہ گئے۔ اور کلّو انھیں وہیں چھوڑ کر اپنے گھر جا پہنچا۔

چاچا لال بُجھکّڑ

شہر کے کسی گنجان محلّے میں ایک بہت فراخ دل شخص رہتے تھے۔ کوئی چاہے ان کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھائے یا نہ بڑھائے لیکن وہ محلّے میں رہنے والے ہر شخص کو اپنا دوست سمجھتے تھے۔ اپنے آپ ایک بڑا فلسفی اور رہنما خیال کرتے تھے۔ ہر کسی کے معاملے میں اپنی ٹانگ اڑانا اپنا پیدائشی حق سمجھتے تھے۔ دوسرے لوگوں کی ان کے متعلق کیا رائے ہے، اس سے انھیں کوئی واسطہ نہ تھا۔ محلّے کے تمام لوگوں میں وہ چاچا لال بجھکڑ کے نام سے مشہور تھے۔

کسی بھی دن چاچا لال بجھکڑ کو اگر یہ پتہ چل جائے کہ محلّے کا کوئی آدمی کسی مُصیبت میں مُبتلا ہو گیا ہے یا کسی پر کوئی مُصیبت آنے والی ہے تو وہ مولا مشکل کشا بن کر فوراً اس کے گھر پہنچ جاتے۔ اور اسے ایسے قیمتی مشوروں سے نوازنا شروع کر دیتے کہ جن پر عمل کرنے سے ٹل جانے والی مُصیبت بھی اس بے چارے کے لیے اٹل بن جاتی۔ ایک بار کسی نے انھیں بتایا کہ آج کل کھجورا سنگھ عجیب اُلجھن میں گرفتار ہے۔ ایک انگریز اُسے نوکری دینے کو تیار ہے بشرطیکہ وہ تھوڑی بہت انگریزی سیکھ لے۔ چاچا فوراً کھجورا سنگھ کے پاس پہنچ گئے اور لگے اپنی انگلش دانی کی شیخی بگھارنے۔ آخر میں اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے: ”کھجورا سنگھ! ہمّت سے کام لو

بھائی۔ انگریزی کون سی اتنی مشکل زبان ہے۔ چند دِنوں میں سکھا دوں گا تمھیں۔" بے چارہ کھجورا سنگھ بھی ان کی باتوں میں آ کر انگریزی سیکھنے کے لیے تیار ہو گیا۔ کئی دِنوں کی دوڑ دھوپ کے بعد چاچا لال بھکڑ نے اُسے انگریزی کے تین الفاظ "یَس (Yes)"۔ "نو (No)" اور "ویری گڈ (Very Good)" رٹا دیے۔ جب یہ تین الفاظ اس نے رٹ لیے تو چاچا نے اپنی تصدیق کی مُہر لگاتے ہوئے کہا کہ کام چلانے کے لیے تو فی الحال اتنی انگریزی ہی کافی ہے۔ جس سے اُسے کسی بھی انگریز کے یہاں آسانی سے نوکری مِل سکتی ہے۔

اگلے ہی دِن کھجورا سنگھ اسی انگریز کی کوٹھی پر پہنچ گیا جس نے اسے نوکری دینے کا وعدہ کیا تھا۔ اسے دیکھتے ہی انگریز نے پوچھا۔ "کیا تم نوکری کے لیے یہاں آئے ہو۔"

کھجورا سنگھ نے جواب دیا۔ "یَس۔"

انگریز نے پوچھا۔ "کیا سو روپے ماہوار تنخواہ پر کام کرو گے۔"

کھجورا سنگھ نے کہا۔ "نو۔"

انگریز نے قدرے سوچ کر فیصلہ کُن لہجے میں کہا۔ "زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ سو روپے تنخواہ ہو سکتی ہے۔ اس سے زیادہ نہیں۔ بولو ٹھیک ہے۔"

کھجورا سنگھ نے کہا۔ "ویری گڈ۔"

کھجورا سنگھ انگریز کے ہاں نوکری کرنے لگا۔ وہ بہت خوش تھا کہ کام تو کچھ خاص ہے نہیں۔ آرام سے ڈیڑھ سو روپے مِل جاتے ہیں۔ ایک دن اتفاق سے انگریز کی گھڑی گم ہو گئی۔ اس نے اپنے تمام نوکروں سے پوچھا لیکن سب

نے یہی کہا کہ ہم نے گھڑی نہیں لی ہے۔ لیکن جب کھجورا سنگھ سے پوچھا "کہ کیا تم نے ہماری گھڑی لی ہے"۔ تو اس نے جواب دیا۔ "یس"۔

انگریز نے کہا۔ "اس کی تو مجھے بھی بہت ضرورت ہے۔ لہٰذا تم میری گھڑی واپس کر دو"۔

کھجورا سنگھ نے بلا سوچے سمجھے جواب دیا۔ "نو"۔

انگریز کو اس کے کورے جواب پر بہت غصہ آیا۔ اس نے کہا۔ "گھڑی واپس دے دو ورنہ تمہیں پولیس کے حوالے کر دوں گا"۔

کھجورا سنگھ نے کہا۔ "ویری گڈ"۔

انگریز نے اسے راستے پر لانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ گھوم پھر کر انگریزی کے وہی تین الفاظ دہراتا رہا۔ مجبوراً انگریز کو پولیس کا سہارا لینا پڑا۔ پولیس جب وہاں پہنچ گئی تو اس نے بھی کھجورا سنگھ سے پوچھا۔ "گھڑی تم نے اُٹھائی ہے کیا؟"

کھجورا سنگھ نے جھٹ جواب دیا "یس"۔

"تو اسے سیدھی طرح واپس کرو گے یا نہیں"۔ پولیس نے اُسے دھمکانے کی کوشش کی۔ کھجورا سنگھ نے اسے بے پرواہی سے جواب دیا "نو"۔

پولیس نے ذرا اور سختی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ "گھڑی واپس نہیں کرو گے تو ہم تمہیں تھانے لے جائیں گے"۔

کھجورا سنگھ نے کہا "ویری گڈ"۔

سیدھی اُنگلی سے گھی نہ نکلتے دیکھ کر پولیس اسے تھانے لے گئی اور ڈنڈوں سے خوب پیٹا۔ شام کو کوتوال نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ ابھی تو اسے

حوالات میں بند کر دو لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ "پُٹ دِی کیس ٹُو مارو"
یعنی معاملہ اگلے دن پھر پیش کیا جائے۔

یہ سُنتے ہی اس کے پاؤں تلے سے زمین کھسکنے لگی۔ ہاتھ جوڑ کر بولا۔ "حضور!
نہ میرے کیس پٹو، نہ مینو مارو" (نہ میرے بال نوچیں نہ مجھے ماریں) میں ابھی
سب کچھ بتائے دیتا ہوں۔ اس پر پولیس نے ہندوستانی زبان میں پُوچھا۔ "تو
پھر بتاؤ تم نے گھڑی کیوں چُرائی تھی؟"

تب اس نے کہا۔ "حضور! میں خُدا کو حاضر ناظر سمجھ کر کہتا ہوں کہ میں نے
کسی کی کوئی گھڑی نہیں چُرائی ہے۔"

یہ سُن کر پولیس بہت حیران ہوئی اور پوچھنے لگی کہ پھر اب تک انگریزی
میں تم اس جُرم کا اقبال کیوں کرتے رہے ہو۔

کھجورا سنگھ نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔ "حضور! انگریزی کے یہ تین
الفاظ چاچا لال بجھکڑ نے مجھے اس انگریز کے ہاں نوکری حاصل کرنے کے لیے
سکھائے تھے۔ لیکن مجھے یہ نہیں پتہ تھا کہ یہی تین انگریزی الفاظ مجھے پولیس
اسٹیشن بھی پہنچا دیں گے۔" یہ کہتے ہوئے جب اس نے تمام قصّہ بیان کیا تو
اس بے چارے کو پولیس کی پٹائی سے چھٹکارا ملا۔

اسی محلّے میں ایک ایم۔ اے پاس نوجوان رہتے تھے۔ چاچا لال بجھکڑ کو
کسی نے بتا دیا کہ اس بے چارے کو دو سال سے کہیں مُلازمت نہیں مل
سکی۔ یہ سُن کر انہیں بہت دُکھ ہوا۔ اسی شام وہ اس نوجوان کے گھر
پہنچے اور کہنے لگے۔ "تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا کہ تم اتنے عرصے
سے بیکار ہو۔"

نوجوان نے بڑی عاجزی سے جواب دیا۔ "غلطی ہو گئی۔ معاف

کر دیجیے۔" چاچا لال بجھکڑ نے بغل میں دبائی ہوئی اپنی کتاب نکالی اور کافی دیر تک اس کے ورق اُلٹتے رہنے کے بعد اس کے ایک صفحہ پر سے کچھ پڑھا اور نوجوان سے مخاطب ہوئے۔ "دیکھو برخوردار! ملازمت ہی روزی کا واحد ذریعہ نہیں ہے۔ مایوس ہونے کی قطعی ضرورت نہیں۔ بے روزگار لوگوں کے لیے میری یہ کتاب ایمپلائمنٹ ایکسچینج سے زیادہ مُفید ثابت ہو سکتی ہے۔ لیکن پہلے یہ بتاؤ کہ تم مچھلیاں پکڑنا زیادہ پسند کرو گے یا مینڈک؟"

نوجوان کی سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ حیران ہو کر بولا "چاچا! میں آپ کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔ ذرا صاف صاف کہیے۔"

چاچا نے اپنی تجویز کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا "دیکھو برخوردار! اگر تم ہر روز پچاس ساٹھ مینڈک پکڑ سکو تو انھیں فروخت کر کے کافی روپیہ کمایا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ تم بھی بخوبی جانتے ہو کہ مچھلیاں تو وہی لوگ خریدیں گے جنھیں کھانے کا شوق ہے لیکن مینڈکوں کو تم ایسے کالجوں میں بیچ سکتے ہو جہاں علمِ حیوانات پڑھایا جاتا ہے۔ . . ."

"معاف کیجیے چاچا! ان میں سے کوئی بھی کام میرے بس کا نہیں۔" نوجوان نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔

"خیر کوئی بات نہیں۔ ہم تمھارے لیے کوئی اور اچھا سا کام ڈھونڈتے ہیں۔" چاچا نے ہمّت نہیں ہاری اور کتاب کھول کر پھر کچھ پڑھنے لگے۔ اور تھوڑی ہی دیر بعد خوشی سے اُچھلتے ہوئے بولے۔ "مل گیا ہے ایک بہت اچھا اور معقول آمدنی والا کام۔ ہاں سُنو! تم خالص شہد اکٹّھا کر کے فروخت کیا کرو۔ اس سے بھی اچھی خاصی آمدنی ہو سکتی ہے۔"

"یہ بھی تو بڑا جان جوکھوں میں ڈالنے والا کام ہے۔" نوجوان نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"شاید تم مکھیوں سے ڈرتے ہو۔ انھیں بھگانے کی ترکیب میں بتائے دیتا ہوں۔" چاچا نے کہا۔

"سنو! خوب اُبلتا ہوا پانی چھتے پر ڈال دو۔ تمام مکھیاں چھتے سے نیچے زمین پر ڈھیر ہو جائیں گی۔ اس کے بعد تم اطمینان سے شہد نچوڑ نچوڑ کر بوتلوں میں بھرتے جانا۔"

بات نوجوان کی سمجھ میں آ گئی اور اگلے ہی دن وہ چھتوں کی تلاش میں ایک جنگل کی طرف نکل پڑا۔ کافی دیر تک مارے مارے پھرنے کے بعد ایک گھنے سے درخت پر ایک چھتہ نظر آیا۔ سوکھی لکڑیاں اکٹھی کر کے پہلے ایک برتن میں پانی گرم کیا۔ اور پھر اس گرم پانی کو لے کر درخت پر چڑھ گیا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ گرم پانی چھتے پر انڈیلتا، مکھیاں اس پر ٹوٹ پڑیں۔ نوجوان گھبرا کر درخت سے نیچے گر پڑا۔ اور اس کی ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ تین ماہ تک مسلسل ٹانگ پر پلستر چڑھائے اسپتال میں پڑا رہا۔ اس کی عیادت کے لیے چاچا اسپتال گئے تو کہنے لگے "دراصل تم نے غلطی کی۔ پچکاری سے چھتے پر پانی ڈالتے تو کیا مجال تھی ان مکھیوں کی کہ تم پر حملہ کرتیں۔ خیر کوئی بات نہیں۔ آئندہ خیال رکھنا۔ اور پچکاری ساتھ لے جانا نہ بھولنا۔"

اسی طرح ایک اور آدمی کو خرگوش پالنے کا بہت شوق تھا۔ اتفاق سے ایک دن اس کا ایک خرگوش کہیں گم ہو گیا۔ وہ بے چارہ پریشان حال اپنے خرگوش کو ڈھونڈتا پھرتا تھا۔ لیکن خرگوش کا کہیں پتہ نہ

چلا۔ چاچالال بجھکڑ کو خبر ملی تو وہ اس کے گھر جا پہنچے۔ اور جاتے ہی اُس سے پوچھنے لگے۔

"آپ کے خیال میں خرگوش کے یکایک گُم ہو جانے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔

"میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا۔ کیا بتاؤں"۔ اس آدمی نے جواب دیا۔

"آپ نے اسے کہیں ڈرایا دھمکایا تو نہیں تھا"۔ چاچا نے پُوچھا۔

مالک نے کہا۔ "اجی چاچا! وہ تو مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز تھا۔ پھر مَیں اسے کیوں دھمکاتا"۔

چاچا نے پوچھا۔ "تو آپ نے کہیں اسے ایسی خوراک کھانے پر مجبور تو نہیں کیا تھا جو اسے اچھی نہ لگتی ہو"۔ یا پھر آپ نے کہیں اس کے آرام میں خلل ڈالنے کی کوشش تو نہیں کی۔

"بالکل نہیں۔ ہر گز نہیں"۔ وہ صاحب اُداس لہجے میں بولے۔

چاچا نے اپنی کن پٹیوں کو کھجاتے ہوئے کہا تو پھر کیا وجہ ہو سکتی ہے۔

"ٹھہریئے مَیں بتاتا ہوں۔ لگتا ہے کہ وہ اپنی بیگم کی خرگوشی سے کسی بات پر ناراض ہو گیا ہے۔ اور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

"ہو سکتا ہے۔ ایسا ہی ہو"۔ مالک نے جواب دیا۔

اجی' ہو سکتا ہے "نہیں سو فی صد یہی ہوا ہے۔ اور وہ اپنی خرگوشنی سے روٹھ کر کہیں چلا گیا ہے"۔

یہ سُن کر اُس آدمی نے کہا۔ "فرض کیجیے آپ کا خیال صحیح ہے تو کیا کیا جا سکتا ہے؟"

اب چاچا لال بجھکڑ نے بڑے اعتماد سے کہا۔ "تو پھر خرگوش کو واپس لانے کا ایک ہی طریقہ ہو سکتا ہے کہ اب خرگوشنی ہی کو اس کی تلاش میں بھیجا جائے۔"

"بھیجا کہاں جائے۔ اس کا کچھ اَتا پَتا بھی تو معلوم ہو۔" مالک نے کہا۔

"اجی اس کی فکر نہ کرو۔ یہ سب خرگوشنی پر چھوڑ دیجیے۔ وہ خود تلاش کرے گی۔"

مالک تو ایسا کرنے کے لیے ہچکچاتا رہا۔ لیکن چاچا نے اس کی ایک نہ مانی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بے چارے کا خرگوش تو گُم ہوا ہی تھا اب وہ خرگوشنی سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا۔

ایسے ہی ایک طالبِ علم تھے۔ پڑھتے وقت اس کی آنکھوں میں درد سا محسوس ہونے لگتا تھا۔ اس نے اپنی آنکھوں کو مُعائنہ کرایا تو ڈاکٹر نے اسے عینک استعمال کرنے کی صلاح دی۔ وہ عینک بنوانے جا رہا تھا کہ راستے میں چاچا لال بجھکڑ مل گئے۔ انھوں نے پُوچھا۔ "کہاں جا رہے ہو برخوردار"۔

"نظر کمزور ہو گئی ہے چاچا۔ عینک بنوانے جا رہا ہوں!" اُس نے جواب دیا۔

چاچا بگڑتے ہوئے بولے۔ "دماغ خراب ہو گیا ہے تمھارا۔ اِسی عُمر میں عینک لگاؤ گے تو بُڑھاپے میں کیا کرو گے؟"

"ظاہر ہے کہ اگر جوانی میں عینک استعمال کروں گا تو بڑھاپے میں بھی عینک ہی لگاؤں گا۔" لڑکے نے کہا۔

یہ سُن کر چاچا کو غُصّہ آگیا اور بولے "اگر جوانی میں یہ حال ہے تو بڑھاپے میں ضرور اندھے ہو جاؤ گے۔ میری مانو اور عینک کا خیال ترک کر دو۔ صبح شام آنکھوں میں روغنِ بادام ڈالا کرو۔ اگر پندرہ ہی دِنوں میں ہی دن کو تارے دِکھائی نہ دینے لگیں تو میرا ذِمّہ۔"

لڑکے نے مُسکراتے ہوئے کہا "دِن میں تارے نہ بھی دِکھائی دیں تو کوئی ہرج نہیں۔ اگر رات ہی کو نظر آجایا کریں تو بڑی بات ہے۔ چاچا!"

"نہیں نہیں، یقین کرو۔ دن کو بھی نظر آجائیں گے۔ میرا آزمایا ہوا نُسخہ ہے روغن بادام۔ اسے استعمال کرنے سے عینک کی قطعی ضرورت نہ رہے گی۔

وہ طالبِ علم بے چارہ مہینہ بھر آنکھوں میں روغن بادام ڈالتا رہا۔ لیکن ہوا کیا۔ رات کو جب چاند کی طرف دیکھتا تو ستارہ سا نظر آتا اور اگر ستاروں کو دیکھنا چاہتا تو مطلع صاف دِکھائی پڑتا۔ غرض مرض بڑھتا گیا جُوں جُوں دوا کی۔ بالآخر جب اس نے دوبارہ آنکھیں ٹیسٹ کروائیں تو مرض دوگنا سے بھی زیادہ بڑھ چُکا تھا، ناچار بے چارے کو عینک لگانی ہی پڑی۔ چاچا لال بجھکڑ نے جب اسے عینک لگائے ہوئے دیکھا تو کہنے لگے "مجھے افسوس ہے کہ اوّل تو تم نے آنکھوں میں روغن بادام ڈالا ہی نہیں۔ یا اگر ڈالا ہے تو اس میں ضرور کچھ مِلاوٹ ہوگی۔ تمھیں خالص روغن بادام ڈالنا چاہیے تھا۔

سچ کا سپاہی

بہت پرانی بات ہے کہ خوشحال پور نام کا ایک بڑا ہی شان دار قصبہ تھا۔ اس قصبے کے لوگ بڑے محنتی، نیک اور خدا پرست تھے۔ وہ دن بھر محنت اور لگن سے کام کرتے اور شام کو اپنے اپنے کاموں سے فارغ ہو کر ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہوتے تھے۔ لوگ اگرچہ مختلف مذہبوں سے تعلّق رکھتے تھے تاہم ایک دوسرے کے مذہب کا احترام کرتے اور ہمیشہ مل جل کر رہتے تھے۔ ایک دوسرے کے تہواروں میں وہ بڑی خوشی سے شریک ہوتے اور آپس میں گلے مل کر اپنی اپنی نیک خواہشات کا اظہار کرتے تھے۔ ان کے بعض عُرسوں اور میلوں ٹھیلوں نے تو عوامی تہواروں کی شکل اختیار کر لی تھی۔ ان کی سماجی زندگی میں اسی رواداری اور فراخ دلی کی بدولت وہ قصبہ رنگارنگ پھولوں کا ایک خوب صورت گلدستہ معلوم ہوتا تھا۔

کہتے ہیں، ایک بار اسی قصبے میں ایک ایسا دولت مند شخص بھی آ کر رہنے لگا تھا جو نہ صرف شر پسند اور مکّار تھا بلکہ اپنی دولت کے نشے میں خدا سے بھی منکر تھا۔ دراصل دولت سے زیادہ وہ شہرت کا بھوکا تھا جسے حاصل کرنے کے لیے وہ کوئی بھی حربہ استعمال کرنے سے نہیں چوکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ قصبے میں اپنی دھاک جمانے کے لیے وہ لوگوں میں پھوٹ ڈالنے کی ترکیبیں

بھی سوچنے لگا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس طرح سے لوگ جب اپنے کسی بھی مسئلہ پر باہم متحد و متفق نہ ہو سکیں گے تو مشورے کے لیے یقیناً اسی کے پاس آیا کریں گے۔ لہٰذا وہ من مانے طریقے سے انھیں انگلیوں پر نچایا کرے گا اور اسی طرح اپنی ساکھ بنائے رکھے گا۔ اسی لیے تو لوگوں میں باہمی اتحاد اور رواداری بھی اسے ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔ اپنے اس مقصد میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے وہ اپنے ہم خیال لوگوں کی ضرورت محسوس کرتا تھا۔ لیکن لوگ اس کی باتوں پر دھیان نہیں دیتے تھے۔ البتہ جب کبھی وہ اپنے گھر سے باہر نکلتا تو راستے میں ملنے والے اپنا اخلاقی فرض سمجھ کر اسے سلام ضرور کرتے تھے۔ اس سے وہ اس قدر مغرور ہو گیا کہ لوگوں سے سلام کا خراج وصول کرنا تو وہ اپنا حق اور ان کے سلام کا جواب دینا اپنی توہین سمجھنے لگا۔

ایک بار اس نے سوچا کہ یہاں کے لوگوں کی زندگی میں مذہب ہی تو سب سے نمایاں پہلو ہے۔ کیوں نہ اسی میں میں میخ نکال کر لوگوں کے جذبات کو بھڑکایا اور انھیں آپس میں لڑایا جائے۔ یہی سوچ کر اس نے عالم دین ہونے کا ڈھونگ رچانا شروع کر دیا۔ اگلے ہی دن کسی عوامی تہوار کے موقعے پر جب لوگ ایک جگہ مل کر بیٹھے تھے تو وہ بھی وہاں پہنچ گیا۔ اور ان کے ایشور اللہ کے متعلق طرح طرح کے بے ہودہ سوالوں کی بوچھاڑ کرنے لگا۔ لوگوں نے پہلے تو مناسب اور موزوں جوابوں سے اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی لیکن جب دیکھا کہ اس نے کسی سے بھی متفق نہ ہونے کی قسم کھا رکھی ہے اور اس کی دلیلوں کا سلسلہ بھی بے ہودگی کی حدوں کو چھونے لگا ہے تو انھوں نے چپ رہنا ہی بہتر سمجھا۔ ان کی خاموشی کو اپنی فتح سمجھ کر وہ اپنے آپ کو تیس مار خاں سمجھنے لگا۔

ایک دن وہ قصبے کے مرکزی حصّے میں ایک چبوترے پر کھڑا اپنی ڈینگیں مار رہا تھا آنے جانے والے اکثر لوگ تو اسے محض سلام کر کے ہی آگے بڑھ جاتے لیکن کچھ تماشائی اس کی خرافات سننے کے لیے کھڑے ہو جاتے تھے۔ اتفاق سے ایک نوجوان وہاں سے گزرا۔ اس کے تن پر نہایت سادہ کپڑے تھے۔ سر پر معمولی سی ٹوپی تھی۔ اور وہ ننگے پیر تھا۔ اس نوجوان نے اس نام نہاد عالم کو سلام نہیں کیا۔ اس غیر متوقع صورتِ حال کو دیکھ کر اس نے لعنت ملامت کرنا شروع کر دیا۔ "کتنے بدتمیز ہیں۔ اس قصبے کے لوگ! کیا وہ لڑکا مجھے نہیں پہچانتا۔ اس گستاخ نے مجھے سلام تک نہیں کیا۔" پھر اس نوجوان کی طرف مخاطب ہو کر بولا۔ "ارے صاحبزادے! کچھ تمیز سیکھو تمھیں معلوم نہیں کہ اگر کوئی عالم اپنے سے اونچی جگہ پر بیٹھا یا کھڑا ہو تو اسے سلام کیا کرتے ہیں۔ جاہل کہیں کے، سمجھتے کیا ہو اپنے آپ کو۔ تمھارے جیسے کئی لڑکے تو ہماری جیب میں پڑے ہیں۔"

یہ محض ذاتی توہین نہ تھی۔ بدتمیز کا خطاب دے کر اس نے تو پورے قصبے کی توہین کی تھی۔ غیرت مند نوجوان اس اجتماعی توہین کو برداشت نہ کر سکا۔ اور بڑے بے باک لہجے میں بولا۔ "کیا مطلب؟ کون ہیں آپ؟ نہ تو میں آپ کو پہچانتا ہوں اور نہ آپ جیسوں کو پہچاننے کی ضرورت محسوس کرتا ہوں۔ خدا کے واسطے آپ اپنی خرافات کا تھیلہ سمیٹ کر فوراً یہاں سے چلے جائیے ورنہ......"

"ورنہ تم مجھے اپنے خدا کے سپرد کر دوگے۔ یہی نا؟ بڑے آئے خدا والے" اس نے کہا، "صاحبزادے! سنا تو ہم نے بھی یہی تھا کہ اس قصبے میں بڑے خدا پرست لوگ رہتے ہیں۔ مگر دیکھا تو ان کی خدا پرستی

سوائے ڈھونگ کے کچھ بھی نہیں۔ ہم بھی تو عالم ہیں۔ ذرا ہماری شاگردی میں آکر دیکھو تو ـــ ہے کوئی خدا کا بندہ جو ہمارے عالمانہ سوالوں کا جواب دے۔ ہم ڈنکے کی چوٹ پر کہتے ہیں کہ اگر وہ ہمیں قائل کر دے تو ہم اس قصبے کو چھوڑ کر کہیں اور چلے جائیں گے۔"

نوجوان نے اس کا چیلنج قبول کرتے ہوئے للکارا۔ "شاید آپ نہیں جانتے کہ اسی قصبے میں اعلا عالم موجود ہیں۔ لیکن عالموں کے دستور کے مطابق ـــ جاہلوں کی خرافات کا جواب ـــ "خاموشی" ـــ سمجھ کر ہی وہ آج تک چپ رہے ہیں۔ اب چونکہ آپ مجبور کر رہے ہیں، تو خدا کے فضل سے خاکسار ہی آپ کے سوالوں کا جواب دینے کے لیے کافی ہے۔ بشرطیکہ آپ اپنے وعدے پر قایم رہیں اور قائل ہونے کی صورت میں فوراً ہی اس قصبے سے چلے جائیں۔"

کچھ لوگ تو پہلے ہی موجود تھے۔ نوجوان کی للکار سُن کر اور بھی لوگ جمع ہونے شروع ہو گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اچھا خاصا مجمع ہو گیا۔ ایک معمولی نوجوان کی ہمّت دیکھ کر لوگ حیران تھے۔ بعض نے سرگوشیاں کرتے ہوئے نوجوان سے پوچھا، کیا آپ واقعی اس کے بے تکے سوالوں کا جواب دے سکیں گے۔ نوجوان نے اسی الوالعزمی سے کہا، "انشاالله۔"

لوگ ابھی تک اسے نوجوان کی ظریفانہ حرکت ہی سمجھ رہے تھے۔ انھیں یقین نہیں آرہا تھا کہ اس معمولی سے لڑکے سے اس بگڑے ہوئے عالم کے بے ہودہ سوالوں کا کوئی خاطر خواہ جواب بن بھی پڑے گا یا نہیں۔ پھر بھی چونکہ یہ ایک بے دام تماشہ تھا جسے دیکھنے کے لیے لوگوں کا ہجوم نوجوان کی جوصلہ افزائی کرنے لگا۔ نوجوان نے اس مغرور عالم سے مخاطب ہو کر کہا،

"فرمائیے عالم صاحب! منظور ہے میری شرط؟"۔
خود ساختہ عالم خوش تھا کہ ان لوگوں کو شرم سار کرنے کا ایک اور سنہرا موقع ہاتھ لگ رہا ہے۔ غرور سے بولا۔" برخوردار! مجھے تو شرط منظور ہے لیکن تم ابھی بچے اور عقل کے کچے ہو۔ میرے عالمانہ سوالوں کا جواب نہیں دے پاؤ گے۔ چاہو تو اپنے ابا جان کو بھی بلا سکتے ہو۔"
نوجوان پر یہ دوسری چوٹ تھی۔ پھر بھی اس نے ضبط کرتے ہوئے کہا۔" فضول باتوں میں میرا وقت ضائع نہ کیجیے۔ بتایئے آپ کا پہلا سوال کیا ہے؟"۔
"تو کیا تم واقعی میرے سوالوں کا جواب دینے کے لیے تیار ہو؟" اس نے حیرانی سے پوچھا۔
"ہاں، ہاں! بالکل تیار ہوں۔" نوجوان نے بے جھجک جواب دیا۔
اس پر "عالم" نے طنزیہ کہا۔" اچھا تو خدا پرست صاحب! بتایئے، اس وقت آپ کا خدا کیا کر رہا ہے۔"
نوجوان نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔" صاحب! آپ تو خود "عالم" ہیں۔ اور یہ بھی بخوبی جانتے ہیں کہ حاجت مند سے حاجت روا کا رتبہ بلند ہوتا ہے۔ لہٰذا اس اخلاقی ضابطے کا لحاظ رکھتے ہوئے پہلے آپ اس اونچی جگہ سے اتر کر نیچے آجایئے۔ تاکہ یہ خاکسار اونچی جگہ پر کھڑا ہو کر آپ کے سوالوں کا جواب دے سکے۔"
نوجوان کی بات کو مذاق سمجھتے ہوئے عالم مسکراتا ہوا نیچے اتر آیا اور لڑکا اسی چبوترے پر جا کھڑا ہوا۔ اور بلند آواز سے پکارنے لگا۔" حضور،

سن لیجیے کہ اس وقت میرا خدا کیا کر رہا ہے۔" پھر لوگوں سے مخاطب ہو کر بولا۔" لوگو! تم گواہ ہو۔ اس وقت جیسا کہ تم دیکھ رہے ہو، میرا خدا ایک منکر کے رتبے کو گھٹا کر ایک خدا پرست کا رتبہ بلند کر رہا ہے۔ اور منکر کو اس کے انکار کی سزا دیتے ہوئے مجھ سے کہہ رہا ہے کہ سچ کبھی جھوٹ کے سامنے نہیں جھکتا۔ سچ کے سپاہی بن کر تم بھی ہمیشہ سچائی پر ڈٹے رہو۔ اگر کوئی اپنی ہی عظمت کے گن گاتے، اسے کبھی عظیم تسلیم نہ کرو۔

یہ سنتے ہی مغرور عالم جواب نیچی جگہ کھڑا تھا، شرم سے پانی پانی ہو گیا۔ نوجوان اسی چبوترے سے پھر پکارا۔" اگر آپ اسے تسلیم کرتے ہیں تو بتائیے آپ کا دوسرا سوال کیا ہے۔"

خود پرست عالم اپنے دل میں سوچ رہا تھا کہ اس بار تو لڑکے نے ہوشیاری سے کام نکال لیا ہے۔ اب اس کی ایک نہیں چلنے دوں گا۔ ایسا سوال پوچھوں گا جس کا جواب بنائے نہ بنے۔ پھر کچھ سوچ کر بولا۔" ہاں برخوردار! ذرا بتائیے تو خدا سے پہلے کیا تھا؟"

نوجوان نے اسی بے پرواہی سے جواب دیا۔" اس سے پیشتر کہ میں کچھ کہوں، مہربانی کر کے آپ خود ہی نو سے الٹی گنتی گننا شروع کریں۔"

اس نے فوراً الٹی گنتی گننا شروع کر دیا۔ نو، آٹھ، سات، چھ، پانچ، چار، تین، دو، ایک، اور ایک کے بعد چپ چاپ کھڑا ہو کر

نوجوان کی طرف دیکھنے لگا۔

نوجوان نے اب کے قدرے زور دے کر کہا، "کیوں صاحب! چپ کھڑے میرا مُنہ کیا دیکھ رہے ہیں — رکیے نہیں۔ گنتے جائیے نا— اور اور اگلا عدد بولیے۔"

اس نے لوگوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، "بولوں کیا خاک! ایک سے پہلے کچھ ہوتا ہی نہیں۔

اب نوجوان نے مُسکراتے ہوئے کہا، "تو بقول آپ کے" ایک سے پہلے کچھ ہوتا ہی نہیں"۔ بس۔ پھر یہی آپ کے سوال کا جواب ہے۔ خدا بھی چونکہ ایک ہے۔ اس سے پہلے بھی نہ کچھ تھا، نہ کچھ ہے، اور نہ ہی کچھ ہوگا۔ یہی وہ سچائی ہے جو وقت کی ضرورت کے مطابق لوگوں کی بھلائی کے لیے کبھی ابراہیم، کبھی موسا، کبھی عیسا، کبھی محمدؐ، کبھی رام، کبھی کرشن، کبھی بُدھ، کبھی مہابیر اور کبھی نانک کے رُوپ میں زندگی کا صحیح راستہ دکھانے دُنیا میں آتی رہی ہے۔ ان کے بتائے ہوئے راستے بھلے ہی مختلف ہوں لیکن سبھی کی منزل وہی ایک سچائی ہے۔"

نوجوان کا جواب سُن کر اب اس "عالم" کو پاؤں تلے سے زمین کھسکتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ حاضرین ہمہ تن گوش کھڑے بڑی دل چسپی سے دونوں کے سوال جواب سے لُطف اندوز ہو رہے تھے۔ نوجوان کے غیر متوقع عالمانہ جوابوں پر کبھی کبھی تو پورے کا پورا مجمع واہ واہ کے شور اور تالیوں کی آواز سے گونج اُٹھتا تھا اور نوجوان کی مُسلسل حوصلہ افزائی کرتا جاتا تھا۔ ابھی وہ علم و فضل کا مدعی پوری طرح سنبھل بھی نہ پایا

تھا کہ نوجوان نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "کیوں صاحب! کچھ اور بھی سوال باقی ہوں تو جلدی پوچھیے۔"

مارے شرم کے اگرچہ اب اُس کے لیے گردن اٹھانا مشکل ہو رہا تھا، پھر بھی وہ بڑی ڈِھٹائی سے بولا۔ "اچھا! خدا اگر ایک ہے تو بتاؤ اس کا مُنہ کس طرف کو ہے۔"

نوجوان نے اب کے حاضرین سے مخاطب ہو کر کہا۔ "اس سوال کا جواب دینے کے لیے مجھے ایک موم بتی کی ضرورت ہے۔ مہربانی کر کے جلدی سے ایک موم بتی کا انتظام کر دیجیے۔ موم بتی فوراً منگوالی گئی۔ نوجوان نے اس موم بتی کو جلایا اور پھر جلتی ہوئی موم بتی کو ایک اُونچی جگہ پر رکھ کر اسی "عالم" سے پوچھا۔ "ذرا آپ ہی بتائیے حضور! اس موم بتی کی روشنی کا رُخ کس طرف کو ہے۔"

"روشنی تو چاروں طرف پھیل رہی ہے۔" اس نے کہا۔

نوجوان نے ایک بار پھر بلند آواز سے حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "لوگو! تم گواہ ہو کہ ان ہی "عالم صاحب" کے مطابق موم بتی کی روشنی چاروں طرف پھیل رہی ہے۔ تو سُن لیجیے حضور! موم بتی کی روشنی کی طرح خدا بھی ایک نور ہے جو پارسیوں کی اگیاری، سلیمان کی ہیکل، گرجا کی صلیب، مسجد کے منارے، مندر کے کلس، گردوارے کے بُرج بلکہ دُنیا کے کونے کونے میں پھیل کر سبھی کو برابر منور کر رہا ہے۔ لیکن اس نور کو دیکھنے کے لیے بلکہ امتیاز مذہب و ملّت ایک گیانی یعنی عارف کی آنکھ چاہیے۔ جاہلوں کی بند آنکھیں اس نور کو نہیں دیکھ سکتیں۔"

نوجوان کے جوابوں کی تاب نہ لاکر اگرچہ وہ مغرور عالم بغلیں جھانکنے لگا تھا، پھر بھی آخری حربے کے طور پر اپنی جگہ سے چل کر اس نوجوان کے پاس پہنچ گیا۔ اور لوگوں کی نظریں بچاکر اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور سونے کے کچھ سکّے نکال کر نوجوان کی جیب میں ٹھونستے ہوئے بولا۔" صاحبزادے! یہ لو اپنی سُنی سنائی چکنی چپڑی باتوں کا انعام ۔۔ اب مجھے سلام کرو، تو چلیں۔"

نوجوان کو اس کی اس بے حیائی سے بڑی تکلیف پہنچی۔ اور وہ منہ پھیرتے ہوئے بولا۔" سونے کے ان چند سکّوں کی چمک سچ کے سپاہی کے قدم نہیں ڈگمگا سکتی۔"

یہ سُن کر اس "عالم" نے اپنی جیب میں رکھی ساری رقم نکالی ۔ اور نوجوان کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔" لگتا ہے میرے معمولی سے سوالوں نے صاحبزادے کو ناراض کر دیا ہے۔ تو میری یہ تمام پونجی حاضر ہے۔ اب تو خوش ہو جاؤ۔ اور اسی خوشی میں ایک سلام بھی ہو جائے۔"

اس کی اس بوکھلاہٹ پر تمام حاضرین کھِل کھِلاکر ہنس پڑے۔ ان کی ہنسی کے دوران نوجوان نے اس سے ساری رقم لے لی اور اسی کے سامنے مجمعے میں موجود غریبوں میں بانٹتے ہوئے بولا" یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس وقت تمھاری جیب بالکل خالی ہے اور میرے پاس خدا کا دیا اب بھی بہت کچھ ہے۔ پھر اس کمتری کی حالت میں بھی برتری کی ڈینگیں مارنے میں نہ جانے کیوں آپ کو کوئی عیب دکھائی نہیں دیتا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دُنیا میں کوئی بھی عیبوں سے بَری نہیں ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ عالم اپنے عیبوں کو خود ہی دیکھ لیتے ہیں۔ جب کہ جاہلوں کے عیب دنیا دیکھتی ہے۔" عالم صاحب!" اب تو

اپنے علم کا اندازہ آپ خود ہی لگا سکتے ہیں۔ پیالے سے آخر وہی چیز ٹپکتی ہے، جو اس کے اندر رہوتی ہے۔"

یہ سنتے ہی پورے مجمعے میں چاروں طرف سے حاضرین کے قہقہوں کے ساتھ ساتھ شرم، شرم کے آوازے بھی گونجنے لگے۔ رسوائی کی تاب نہ لا کر اس "عالم" نے سپیج کے سپاہی کو تین بار جھک، جھک کر سلام کیا اور مارے شرم کے منہ چھپا کر ایسا بھاگا کہ پھر کسی نے بھی اسے خوشحال پور قصبے میں نہیں دیکھا۔

تین مُرادیں

چودھری میوہ رام اَدھیڑ عُمر کے ایک بڑے ہی روا اور مِلن ساز آدمی تھے۔ وہ اپنے گاؤں کے پرائمری اسکول میں ہیڈ ماسٹر تھے۔ اپنے اسکول کے بچّوں کا وہ بہت خیال رکھتے تھے۔ اور انھیں مُستقبل کے اچھّے شہری بنانے کے لیے جی جان سے کوشش کرتے تھے۔ ان کی مالی حالت اگرچہ زیادہ اچھّی نہ تھی پھر بھی اپنے بیوی بچّوں کے ساتھ صبر و قناعت کی زندگی بسر کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ نہ صرف اپنے بلکہ آس پاس کے گاؤں کے لوگ بھی اُن کی بہت عزّت کرتے تھے۔ اور اپنے ذاتی کاموں میں ان سے مشورہ لینے ان کے گھر آتے تھے۔ ہر ملاقاتی کی حسبِ مقدور سیوا کرنا وہ اپنا دھرم سمجھتے تھے۔ اس فراخ دلی اور انسانی خِدمت کے نتیجے میں کبھی کبھی تو انھیں خود بھُوکا رہنا پڑتا تھا۔

اتوار کا دن تھا۔ اسکول سے چھُٹّی تھی۔ صُبح صُبح ہی چار پانچ آدمی اُنھیں مِلنے کے لیے آ گئے۔ چودھری صاحب نے بیوی سے چائے بنانے کے لیے کہا۔" تھوڑی ہی دیر میں بیوی چائے بنا کر لے آئی۔ انھیں چائے پی کر رُخصت ہوئے ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ کچھ اور لوگ آ گئے۔ انھوں نے بیوی کو آواز دے کر کھانا بنانے کے لیے کہا۔

جب وہ کھانا کھا کر چلے گئے تو بیوی اپنے بچّوں کو کھانا کھلانے لگی۔ بیوی نے ابھی کھانا نہیں کھایا تھا کہ کوئی اور صاحب تشریف لے آئے۔ رشتے دار آدھمکے۔ بیوی نے پھر سے چولھا جلایا اور چائے کے لیے پانی رکھتے ہوئے سوچا، کیوں نہ چائے کچھ زیادہ بنالی جائے۔ کھانا اگر نہیں بچا تو نہ سہی۔ چائے پر بھی تو گزارا کیا جا سکتا ہے۔ جب دُودھ ڈالنے لگی تو دیکھا کہ برتن میں دُودھ بہت کم ہے۔ اس نے چائے کا کچھ پانی ایک برتن میں نکال کر رکھ لیا۔ اور باقی میں دُودھ ڈال کر چائے مہمانوں کو پہنچا دی۔ پاس ہی حلوائی کی دوکان تھی۔ جلدی سے جاکر وہ دُودھ لے آئی۔ چائے کے اسی بچے ہوئے پانی کو پھر سے گرم کیا اور اس میں دُودھ ڈال کر برتن نیچے اُتارا ہی تھا کہ چودھری صاحب نے پھر آواز لگا دی "بھاگوان! تین کپ چائے اور بنا دو۔ صبر شکر کرتے ہوئے بیوی نے بنی بنائی وہی چائے ان مہمانوں کی خدمت میں پیش کر دی۔ اور سوچنے لگی " وہ چائے بھی جن کے نصیب میں تھی، انھیں مل گئی۔ لگتا ہے آج تو چائے بھی میری قسمت میں نہیں ہے۔"

رات کو جب آنے جانے والوں کا سلسلہ ختم ہوتا اور بچے بھی سو جاتے تو میاں بیوی بیٹھ کر آپس میں دُکھ سُکھ کی کچھ باتیں کرتے۔ باتوں باتوں میں بیوی اپنی لاچاری اور قسمت کا رونا روتے ہوئے اکثر یہی کہتی "یہ جانتے ہوئے بھی کہ ہماری آمدنی تو اپنا اور بچّوں کا پیٹ پالنے کے لیے بھی کافی نہیں ہے۔ نہ جانے کیوں آپ نے گھر کو سرائے بلکہ ہوٹل بنا رکھا ہے۔ صبح سے شام تک تھکے ماندے،

بھوکے پیاسے لوگوں کا تانتا لگا رہتا ہے۔ آخر کسی شریف کا گھر ہی سرائے کیوں سمجھ لیا جاتا ہے۔ گاؤں میں اور بھی تو لوگ ہیں جو اتنے پڑھے لکھے بھی نہیں۔ پھر بھی بڑے عیش و آرام کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان کے ہاں اتنے مہمان کیوں نہیں آتے۔ اگر آتے بھی ہیں تو وہ انھیں منہ نہیں لگاتے۔ لیکن ایک آپ ہیں، جن پر کہ خود بھوکے پیاسے رہ کر بھی لوک سیوا کی دُھن سوار ہے۔

زندگی میں ایسی تلخ گھڑیاں اکثر آتی ہی رہتی تھیں جب چودھری صاحب بیوی کی ایسی کھری کھری باتیں سُن کر اُداس ہو جاتے اور اسے سمجھاتے ہوئے کہتے "بھاگوان! مکھیاں ہمیشہ گُڑ پر ہی بیٹھتی ہیں۔ صبر سے کام لو۔ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ بھگوان تمھیں اس کا پھل ضرور دے گا۔ اپنا اپنا پیٹ تو جانور بھی بھر لیتے ہیں۔ آدمی وہی ہے جو آدمی کے کام آئے۔ شُکر کرو کہ اپنا روزگار شریفانہ ہے۔ جھوٹ، چوری، ٹھگی، رشوت وغیرہ سے پاک ہے۔ پھر اس تھوڑے بہت علم کی بدولت ہی تو لوگ ہماری عزّت کرتے ہیں۔ ورنہ ہمیں کون پُوچھتا"

بیوی پر شوہر کی ان باتوں کا کوئی اثر نہ ہوتا۔ وہ اور بھی بگڑتے ہوئے کہتی "یہ عزّت اور شرافت جس کے گیت آپ دن رات گاتے رہتے ہیں، ہمارے لیے آرام کا ذریعہ تو نہیں بن سکتے۔ نہ تو یہ ہمارے اوڑھنے کے کام آسکتے ہیں نہ بچھونے کے۔ اور نہ ہی یہ ہمارے بھوکے پیٹ بھر سکتے ہیں۔ بھوکے پیٹ سے تو بھگوان کا بھجن بھی نہیں ہوتا۔ پھر ایسی خیالی عزّت اور شرافت سے کیا فائدہ۔ دوسروں

کی طرح ہمیں بھی آرام چاہیے۔ آرام کا سامان چاہیے۔ پیٹ بھر کھانا چاہیے۔ ہماری بھی تو کچھ تمنّائیں ہیں۔ آخر کب تک آپ ہمارے ارمانوں کا گلا گھونٹتے رہیں گے؟"

بیوی کی یہی کڑوی کسیلی باتیں انھیں سخت ناگوار گزرتیں اور اُداس ہو کر کبھی کبھی تو میوہ رام بھگوان سے پرارتھنا کرنے لگتا۔ "اے دونوں جہاں کے پروردِگار! اپنے اس غریب پر رحم کر اور مہربان ہو کر اپنی کسی غیبی طاقت سے ایسا مالامال کر دے کہ تیری اس بھری دُنیا میں یہ بھی کچھ دن امن و سکون کی زندگی بسر کر سکے۔" رفتہ رفتہ اسی امید پر کہ شاید کبھی اس کی یہ پرارتھنا قبول ہو جائے سونے سے پہلے ہر رات یہی دُعا مانگنا انھوں نے اپنا معمول بنا لیا۔

دیوالی کی رات تھی۔ لوگوں نے اپنے اپنے گھروں میں خوب دیے جلائے۔ اور دھن دولت کے حصول کے لیے لکشمی دیوی کی پُوجا کرنے لگے۔ چودھری صاحب کے گھر بھی مٹّی کے کچھ دیے ٹمٹما رہے تھے۔ لیکن لکشمی پُوجا سے پہلے ہی بیوی اپنے دُکھوں کا پٹارا کھول کر ان کے دِل و دماغ کا سارا سکون تہس نہس کرنے پر تُلی ہوئی تھی۔ لکشمی جی سے پہلے انھوں نے اپنی بیوی سے پرارتھنا کرتے ہوئے کہا کہ وہ ان کے حال پر رحم کھاتے ہوئے انھیں اکیلا چھوڑ دے اور جا کر آرام سے سو جائے۔ بیوی بڑبڑاتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اس کے چلے جانے کے بعد میوہ رام نے پُوجا کی سالگری سنبھالی اور بڑے ہی دُکھی دل سے لکشمی دیوی کے چرنوں میں گڑگڑا کر دھن دولت کے لیے پرارتھنا کرنے لگا۔ پٹاخوں، آتش بازی اور چراغوں کی رنگین رات

ہیں کچھ عیاش لوگ تو جوئے اور شراب کی رنگ رلیوں میں مست تھے لیکن وہ بے چارے رات بھر دیوی کے چرنوں میں گڑگڑاتے رہے۔ جب نور کا تڑکا ہوا تو انھیں ایسا محسوس ہوا جیسے ان کے چاروں طرف تیز روشنی سی پھیلتی جا رہی ہو۔ اس تیز روشنی میں، انھوں نے دیکھا کہ وہاں پر لکشمی جی ظاہر ہو گئی ہیں۔ اور کنول کے ایک خوب صورت پھول میں کھڑی انھیں آشیرباد دیتے ہوئے بڑی ہی مدھر آواز میں کہہ رہی ہیں۔ "اے میرے بھگت! تیری پرارتھنا سویکار ہوئی۔ یہ لو اپنی سیوا کا میوہ۔ میں تمھیں چاندی کے یہ تین چمک دار سکّے دیتی ہوں۔ یہی تین سکّے تمھارے من کی مرادیں پوری کریں گے۔ ضرورت پڑنے پر ایک سکّے کو اشنان کرا کے مجھے یاد کرنا۔ تمھارے دل کی مراد پوری کرنے کے بعد سکّہ غائب ہو جائے گا۔ اس طرح سے میں تمھاری زندگی کی تین مرادیں پوری کرنے کا بچن دیتی ہوں۔ چاہے وہ کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہوں۔"

چاندی کے تینوں سکّے میوہ رام نے بڑی مضبوطی سے اپنی مٹھی میں تھامے ہوئے تھے۔ پہلے تو انھیں یقین نہیں آ رہا تھا۔ اور اس چمتکار کو محض خواب ہی سمجھ رہے تھے۔ لیکن اپنے ہوش و حواس کو یکجا کر کے جب انھوں نے مٹھی کھول کر دیکھا تو تینوں سکّوں کو بدستور اپنی مٹھی میں دیکھ کر پاگل ہو اُٹھے۔

دوسرے ہی لمحے وہ عجیب شش و پنج میں مبتلا ہو گئے۔ "مرادیں پوری ہوں گی ہ! اور وہ بھی تین ہ!" اور پھر اس گمبھیر معاملے پر سنجیدگی سے غور کرنے لگے کہ آخر وہ تین مرادیں کون کون سی ہونی چاہئیں۔ پھر مزید

انتظار نہ کرتے ہوئے انھوں نے بیوی کو جگایا اور سارا ماجرہ کہہ سُنایا اور برکت والے وہ تینوں سکّے اسے دِکھاتے ہوئے بولے۔ "بھاگوان! اب تمہارے دُکھوں کا اَنت آ گیا ہے۔ بتاؤ تمہارے دِل کی پہلی مُراد کیا ہے؟ دیکھتے ہی دیکھتے دیوی تمہارے دل کی مُراد پوری کر دے گی۔ چاہے وہ دُنیا کی کتنی بھی بیش قیمت چیز کیوں نہ ہو۔ لیکن دیوی نے صرف تین مُرادیں پوری کرنے کا بچن دیا ہے۔ اس لیے ذرا عقل کو ٹھکانے رکھ کر ہی مُرادیں مانگنا۔ عقل کا چراغ گُل ہوتے دیر نہیں لگتی۔ ایسا نہ ہو کہ بنا بنایا کھیل چوپٹ ہو جائے۔"

اپنے اس وسوسے کی مزید وضاحت کرتے ہوئے انھوں نے بیوی کو بتایا کہ ایک بار عقل خوب بن ٹھن کر لُقمان حکیم کے پاس گئی تو انھوں نے پُوچھا "ارے تم کون ہو، اور کہاں رہتی ہو؟" اس نے جواب دیا۔ "مجھے عقل کہتے ہیں اور مَیں انسان کے ماتھے میں رہتی ہوں۔" تھوڑی دیر میں شرم بھی وہاں آ پہنچی۔ لُقمان نے اس سے بھی یہی پُوچھا۔ اس نے کہا۔ "مہاراج! مَیں شرم ہوں اور آنکھوں میں رہتی ہوں۔" اس کے بعد مُحبّت بھی وہیں چلی آئی۔ لُقمان نے اس سے بھی پُوچھا "تم کون ہو، اور کہاں رہتی ہو؟"۔ اس نے جواب دیا "مہاراج! مَیں مُحبّت ہوں اور آدمی کے دِل میں رہتی ہوں۔" لُقمان حکیم ابھی ان تینوں کا اَتا پتا ہی پُوچھ رہے تھے کہ تین اور ہستیاں آتی دِکھائی دیں۔ پاس آنے پر لُقمان نے ان میں سے ایک کو مخاطب کرتے ہوئے پُوچھا۔ "آپ کون ہیں؟ اور کہاں رہتے ہیں؟" اس نے بتایا "مجھے تقدیر کہتے ہیں۔ اور میرا ٹھکانہ آدمی کا ماتھا ہے۔" اس پر لُقمان نے عقل کی طرف

دیکھتے ہوئے کہا" ارے! یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ایک میان میں دو تلواریں نہیں سما سکتیں۔ وہاں تو عقل رہتی ہے"۔ اتنے میں عقل خود ہی بول اُٹھی" مہاراج! یہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔ کیونکہ جب تقدیر آتی ہے تو عقل اپنے ٹھکانے پر نہیں رہتی"۔ پاس ہی عشق کھڑا تھا۔ لُقمان نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پُوچھا۔ "تم کون ہو؟ اور کہاں رہتے ہو؟" وہ بولا۔" حضور میرا نام عشق ہے اور میں انسان کی آنکھوں میں رہتا ہوں۔ لُقمان نے کہا۔" نہیں! شاید تم غلط کہہ رہے ہو۔ وہاں تو شرم رہتی ہے"۔ اس نے جواب دیا۔" ہاں! آپ بھی دُرست فرماتے ہیں۔ لیکن جب عشق غالب آتا ہے تو شرم غائب ہو جاتی ہے"۔ طمع سب سے آخر میں کھڑی تھی۔ لُقمان نے اس سے بھی یہی پُوچھا۔ اس نے کہا" مہاراج میں طمع ہوں اور آدمی کے دِل میں رہتی ہوں"۔ لُقمان نے کہا" نہیں! آدمی کے دل میں تو محبّت رہتی ہے۔ وہاں تم کیسے ٹھہر سکتی ہو؟ اس نے جواب دیا" یہ تو ٹھیک ہے مہاراج! لیکن طمع جب آدمی کے دِل میں گھر کرتی ہے تو محبّت اپنا بستر گول کر جاتی ہے"۔

چودھری میوہ رام پھر اپنی بیوی کو خبردار کرتے ہوئے بولے" کیا سمجھی؟ یہ عقل مندوں کی باتوں کا نچوڑ ہے۔ اس لیے تو تمھیں بار بار کہہ رہا ہوں کہ مُراد خوب سوچ سمجھ کر مانگنا۔ ایسا نہ ہو کہ تمھاری بھی عقل ٹھکانے نہ رہے۔ طمع کے جھانسے میں آ کر تم بھی شرم و حیا کھو بیٹھو اور بعد میں اپنے ہی کیے پر پچھتانا پڑے"۔

ساری رات اگرچہ آنکھوں میں کاٹی تھی لیکن اب بھی انھیں نیند نہیں آ رہی تھی۔ وہ دونوں مل کر سوچنے لگے کہ ان کی پہلی مُراد کیا ہونی

چاہیے۔ میوہ رام تو ابھی زندگی میں اُتار چڑھاؤ کے بارے میں سوچ ہی رہے تھے کہ بیوی نے اُٹھ کر لیمپ جلا دیا۔ لیمپ کے پاس ہی ایک شکستہ سا شیشہ پڑا تھا۔ بیوی کے دل میں آئی کہ بہت دنوں سے اپنی شکل دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔ "آج میں بہت خوش ہوں۔ ذرا اپنی شکل تو دیکھ لوں۔" اس نے شیشہ اُٹھا کر دیکھا اور سوچنے لگی، دُنیا بھر کے دُکھوں کی تاب نہ لا کر اس کا پھول سا چہرہ کتنا مُرجھا گیا ہے۔ اور اس کا رنگ بھی کالا سا پڑنے لگا ہے۔ سر کے بالوں پر سفیدی چمکنے لگی ہے۔ کچھ دیر کھڑی وہ شیشے میں گھور گھور کر دیکھتی رہی۔ پھر کچھ سوچا اور شوہر کے پاس جا کر بولی "سُنیے! اس میں شک نہیں کہ سب سے پہلے ہمیں دیوی سے دھن دولت، زمین اور اس پر باغ، باغیچے اور رہنے کے لیے عالیشان مکان کی مُراد مانگنی چاہیے۔ لیکن سوچتی ہوں کہ جو شخص اتنی جائداد کا مالک ہو، اس کی بیوی کا خوبصورت ہونا ان سب سے زیادہ ضروری ہے۔ ضروریاتِ زندگی کی سبھی چیزیں تو ہم مانگیں گے ہی۔ میرا خیال ہے کہ سب سے پہلے آپ یہ مُراد مانگیں کہ صبح ہونے سے پہلے دیوی آپ کی بیوی کو ملکۂ حُسن بنا دے۔"

یہ سُنتے ہی میوہ رام کو جیسے بجلی کا جھٹکا سا لگا ہو۔ اس کے ہونٹ کپکپائے لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتے بیوی انھیں پکڑ کر اسی جگہ پر لے گئی جہاں وہ پُوجا کر رہے تھے۔ اب وہ ان سے اپنی من چاہی مُراد مانگنے پر اصرار کرنے لگی۔ ناچار انھوں نے کنوئیں سے تازہ پانی منگوایا۔ اور بیوی کو دوسرے کمرے میں چلے جانے کے لیے کہا۔ اس کے بعد انھوں نے سکّے کو اشنان کرایا۔ پھر دُھوپ جلایا آنکھیں بند کیں اور دیوی کا دھیان دھر کر بیوی کی خواہش کے مطابق اپنی پہلی مُراد مانگی "اے دیوی! میری بیوی کو ملکۂ حُسن بنا دو۔"

کچھ ہی دیر میں اس کے کانوں کو بڑی ہی نرم و نازک آہٹ سُنائی

دی۔ انھوں نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو سکہ غائب تھا۔ میوہ رام کو یقین ہو گیا کہ اب وہ ایک ملکۂ حسن کے شوہر ہیں اس کے ساتھ ہی سر جھکا کر وہ سوچنے لگے کہ اس کا انجام تو سوچا ہی نہ تھا۔ شاید یہ مُراد مانگنے میں انھوں نے جلد بازی سے کام لیا ہے۔ پھر یہی سوچ کر کہ تیر تو کمان سے نکل ہی چکا ہے۔ اب ایسے وسوسوں کو دل میں لانے سے کیا فائدہ۔ دیوی کو نمشکار کر کے وہ اُٹھ کھڑے ہوئے اور خوشی خوشی دوسرے کمرے کی طرف چل دیے۔

دوسرے کمرے میں جا کر کیا دیکھتے ہیں کہ ان کی ملکۂ حسن شیشہ ہاتھ میں لیے اپنے حسن کا جلوہ دیکھنے میں محو ہے۔ کافی دیر تک یونہی کھڑی وہ شیشہ دیکھتی رہی۔ یہاں تک کہ اسے میوہ رام کے آنے کا بھی پتا نہ چلا۔ پھر وہ اس حسن کے شایان شان کسی اچھے جوڑے کی تلاش میں جوانی کے دنوں کے بکس میں رکھے کپڑوں کو اُلٹ پلٹ کر دیکھنے لگی۔ لیکن ملکۂ حسن کو ان میں سے کوئی بھی جوڑا پسند نہ آیا۔ پھر ایک کام چلاؤ جوڑا پہن کر سوچنے لگی "صبح ہوتے ہی سب سے پہلے تو مجھے شہر جا کر اپنے لیے کچھ عمدہ کپڑے خرید کر لانے چاہئیں"۔ چنانچہ ساری جمع پونجی سمیٹ کر وہ شہر جانے کے لیے تیار ہو گئی۔ اور جاتے جاتے میوہ رام سے کہہ گئی " بچوں کو نہلا دُھلا کر خود ہی ناشتہ کرا دینا۔ اور اپنے ساتھ اسکول بھی لے جانا۔ اگر مجھے کچھ دیر ہو جائے تو ذرا جلدی آ کر دوپہر کا کھانا بھی تیار کر لینا۔"

میوہ رام بُت کی طرح کھڑے چُپ چاپ سُنتے رہے اور وہ شہر چلی گئی۔ بچوں کی توُتوُ، مَیں مَیں سُن کر ان کی گہری سوچ کا سلسلہ ٹوٹا تو بچوں کے لیے ناشتے کی فکر ہوئی۔ جب وہ خود ہی ناشتہ تیار کر رہے تھے تو بچوں نے آ کر پوچھا "پاپا جی! ممی کہاں گئی ہیں؟"

بچوں کو بہلانے کے لیے انھوں نے کہا "بیٹے! وہ کسی ضروری کام سے گئی ہیں۔ بس آتی ہی ہوں گی۔" ناشتہ کھلا کر وہ بچوں کو اسکول لے گئے۔ اور سیکنڈ ماسٹر سے کہہ کر کہ "آپ بچوں کا خیال رکھنا مجھے کچھ ضروری کام ہے اس لیے جا رہا ہوں۔"

گھر پر سارا کام یونہی پڑا تھا۔ واپس آکر انھوں نے پہلے تو پورے گھر میں جھاڑو دی۔ پھر برتن صاف کرنے لگے۔ اس کے بعد اپنے اور بچوں کے کپڑے دھونے تھے۔ کپڑے سوکھنے کے لیے پھیلا کر دوپہر کے لیے دال سبزی کی فکر ہوئی تو پیسے تلاش کرنے لگے لیکن چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں۔ ساری پونجی تو بیوی سمیٹ کر لے گئی تھی۔ ناچار دروازے میں بیٹھ کر بیوی کو کوسنے لگے۔

دوپہر بعد کہیں دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے دروازہ کھولا تو وہ ایک مزدوروں کے ساتھ بیوی باہر کھڑی تھی۔ بیوی نے سامان اندر رکھوایا اور پیسے دے کر مزدوروں کو چلتا کیا۔ دوسرے ہی لمحے نئے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی ہو کر وہ اپنے نئے کپڑے اور زیور پہننے لگی۔ اس کے بعد اس نے بالوں میں کنگھی کی اور ہار سنگار کرنے میں لگ گئی۔ میوہ رام کھڑے کھڑے اس کی حرکتیں دیکھتے اور دل ہی دل میں کڑھتے رہے اتنے میں بیوی بھی عجیب انداز سے ان کی طرف دیکھنے لگی۔ پھر مسکراتی ہوئی دھیرے دھیرے ان کی طرف بڑھی اور ان کے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی "کیوں جی! کیا بات ہے۔ ملکہ حسن کے شوہر بن کر تو آپ بات بھی نہیں کرتے۔ آپ نے نہ میرے حسن کی داد دی، نہ کپڑوں اور زیوروں کی تعریف کی۔ کیا ابھی سے اپنی ملکہ حسن سے جی بھر گیا ہے؟"

پہلے تو وہ بُت بنے جُوں کے تُوں کھڑے رہے۔ پھر یہ سوچ کر کہ اس وقت یہ ہوا پر اُڑ رہی ہے، ملامت کرنا مناسب نہ سمجھا۔ بڑی نرمی سے بولے۔ "بھاگوان یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ مجھے تو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا۔ اس وقت تم واقعی ملکہ حُسن ہو۔ نہ صرف تمہارا حُسن بلکہ زیور اور پوشاک سب لاجواب ہیں۔ لیکن آج تو آپ نے غضب کر دیا۔ نہ بچّوں کو نہلایا۔ نہ ناشتہ تیار کیا۔ نہ جھاڑو دی، نہ برتن مانجھے، نہ ۔۔۔۔۔"

ابھی وہ اپنی بات پوری بھی نہ کر پائے تھے کہ آئینے میں اپنے حُسن کا جلوہ دیکھتے دیکھتے بیوی غُصّے سے چیخنے لگی۔ "قسمت تو میری اسی دن پھُوٹ گئی تھی جس دن آپ سے ساتھ شادی ہو گئی۔ جب اپنے مائیکے سے آئی تھی تو کتنی خوب صورت تھی۔ میرا وہ حُسن اور جوانی تو رئیسوں کے شاہانِ شان تھا۔ تیلی کیا جانے مشک کا بھاؤ۔ ایک اسکول ماسٹر جس کی ساری زندگی پڑھتے پڑھاتے اور لوگوں کے ساتھ گپ ہانکتے گزری ہو اس کی ساری عقل تو اسکول کے بچّے اور ملاقاتی اُڑا لے جاتے ہیں۔ چلے ہیں مجھے نصیحت کرنے۔ سُنتے سُنتے میرے تو کان پک گئے ہیں۔ البتّہ آپ کان کھول کر سُن لیجیے۔ ملکہ حُسن کا یہ نازک جسم نرم نرم گدّوں کے لیے ہے۔ آپ کی چُولھا چکّی کرنے کے لیے نہیں۔ اگر آپ سے نہیں ہوتا تو جھاڑو پونچھا کرنے، برتن مانجھنے اور چُولھا پھونکنے کے لیے کوئی باورچن لے آئیے۔ میرے یہ نازک ہاتھ اب ایسے گندے کام نہیں کریں گے۔ ان ہی کاموں نے تو پہلے بھی میری جوانی کو گھُن لگایا تھا۔ دن رات سیوا کرتے کرتے مر گئی لیکن آپ نے میری کچھ بھی قدر نہ کی۔ بھگوان نے آج مجھے اپنے صبر کا پھل دیا تو آپ کے سینے پر سانپ لوٹنے لگا ہے۔ لعنت ہے اس دن پر جس دن آپ کے پلّے پڑ گئی۔"

میوہ رام دُکھی دل سے چُپ چاپ کھڑے اس کا بھاشن سُن رہے تھے۔ وہ حیران تھے کہ یہی بیوی جو پہلے کبھی ایسے نہ بگڑتی تھی، راتوں رات اس کی کایا کیسے پلٹ گئی۔ ملکہ حُسن بننے کے ساتھ ساتھ اس کی زبان بھی کتنی لمبی ہوگئی ہے۔ صلواتیں سُناتی چلی جا رہی ہے۔ لگتا ہے۔ دیوی کا بردان اسے راس نہیں آیا۔ اُلٹا بیوی ہی ہاتھ سے نکلتی جا رہی ہے۔ اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ کاش وہ اپنی تقدیر پر شاکر رہتا۔

جیسے جیسے وہ بیوی کی بد کلامی پر سوچتا گیا، اس کے دل میں انتقام کا جذبہ پیدا ہوتا گیا اور اس نے بیوی کو زبان درازی کا ایسا مزا چکھانے کی ٹھان لی جسے وہ عمر بھر یاد رکھے۔ "اپنے حُسن کا جلوہ دیکھ کر بدکار کی ساری شرم جاتی رہی۔ دُنیا کی طمع دل میں آتے ہی زندگی بھر کی محبت پر پانی پھیر دیا۔ ناشکری کہیں کی۔ میری ساری نیکیوں کو بٹّہ لگا دیا۔ ایک ہی دن میں اگر یہ اتنی بدل سکتی ہے تو آگے چل کر نہ جانے کیا کیا گُل کھلائے گی۔ کسی نے سچ کہا ہے، کُتّے کو گھی ہضم نہیں ہوتا۔"

اس مصیبت سے چھٹکارا پانے کے لیے اب ان کے پاس سوائے اس کے کوئی راستہ نہ تھا۔ کہ وہ دیوی سے اپنی دوسری مُراد مانگیں۔ کروٹیں بدلتے بدلتے رات کاٹی اور صبح ہوتے ہی جب کہ ان کی بیوی ابھی میٹھی نیند کے مزے لے رہی تھی۔ انھوں نے دوسرے سکّے کو اشنان کرا کے دھوپ جلایا اور دیوی کا دھیان دھر کر دوسری مُراد مانگی "اے دیوی! تیری دی ہوئی حُسن کی بخشش اس ملکہ حُسن کو راس نہیں آئی۔ میرے حال پر رحم فرماتے ہوئے اسے کُتیا بنا دو۔"

تھوڑی ہی دیر میں بغل والے کمرے سے کسی خوف ناک کُتیا کے

بھونکنے کی آواز سنائی دی۔ دیوی کو نمشکار کرکے انھوں نے پوجا ختم کی۔ دوسرے کمرے میں جانے کی بجائے وہ اپنے کسی دوست کے ہاں چلے گئے اور وہیں ناشتہ کرکے اسکول کا راستہ لیا۔ شام کو جب گھر لوٹے تو کیا دیکھتے ہیں کہ اسی کُتیا نے بھونک بھونک کر سارا گاؤں اکٹھا کر رکھا ہے۔ اور لوگ اسے چڑانے میں مزا لے رہے ہیں۔ بچّے الگ سہمے ہوئے ایک کونے میں گھسے ہوئے ہیں اور بیوی بھوں بھوں کرتی سبھی کو کاٹ کھانے کے لیے دوڑتی پھر رہی ہے۔

چودھری میوہ رام سے یہ دل شکن منظر دیکھا نہ گیا۔ خیریت یہ رہی کہ لوگوں کو اس کُتیا کی اصلیت کا علم نہیں ہو سکا تھا۔ اس راز کو راز ہی رکھتے ہوئے انھوں نے سرِ شام ہی تیسرے چمک دار سکّے کو بھی اشنان کرایا اور بڑی مایوسی کی حالت میں دُھوپ بھی جلایا۔ پھر گڑگڑا کر دیوی سے اپنی تیسری اور آخری مُراد مانگنے لگے۔ "اے دیوی! اگر تم میری بیوی کو اس کی حالت ہی پر لا دو تو میں تمھارا لاکھ لاکھ شکر ادا کروں گا۔"

دوسرے ہی لمحے ان کے کانوں کو ایک عجیب سی آہٹ سنائی دی۔ انھوں نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو چمک دار سکّہ غائب تھا۔ دیوی کو نمشکار کرکے وہ اُٹھے ہی تھے کہ بغل والے کمرے سے آواز آئی۔ "میں نے کہا، آپ اسکول سے آ گئے کیا؟ کہو تو چائے بنا کر لاؤں۔"